جاسوسی اور طنز و مزاح پر بہترین کہانیاں

قابلِ اعتراض تصویر

ابنِ صفی

اسرار پبلیکیشنز

بیڈن روڈ لاہور

بقلم خود

بچپن میں 'بقلم خود' کی ترکیب نہ جانے کیوں صاحبِ قلم کی ہی حیثیت کا ایک حصّہ معلوم ہوتی تھی۔ مثلاً اگر کہیں 'تفضل حسین بقلم خود' لکھا ہوا نظر آجاتا تو تصور میں 'سر تفضل کا ادھڑ اُلّو کا'۔ ۔ ۔ گلے میں ہار ڈالے کسی درخت کی ٹہنی پر براجمان' قسم کا نقشہ بن کر رہ جاتا۔

اس زمانے میں یہ عام رواج تھا کسی کو خط بھی لکھتے تھے تو آخر میں اپنا نام لکھ کر بقلم خود ضرور ٹانک دیتے تھے۔

بہر حال تشویش ہے کہ اس 'ڈائجسٹ' کے کرتا دھرتا بھی بقلم خود سے متعلق اسی قسم کا کوئی تصور تو وابستہ نہیں رکھتے۔ اگر اس سلسلے میں اُن کی نیّت صاف ہے تو پھر وہ سمجھتے ہوں گے کہ اس مضمون کے علاوہ میں نے اور کچھ بھی بقلم خود نہیں لکھا، کسی سے لکھواتا رہا ہوں۔

پھر سوچتا ہوں شاید بقلم خود سے مراد خود نوشتہ حالاتِ زندگی ہو،

لہٰذا اِسی مفروضے پر مضمون کی ابتدا کرتا ہوں۔

اپریل ۱۹۲۸ء کی کوئی تاریخ تھی اور جمعے کا دن شام کے دھندلکوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ جب میں نے پہلی بار اپنے رونے کی آواز سنی۔ ویسے دوسروں سے سنا ہے، اتنا نحیف تھا کہ رونے کے لیے منہ تو کھول سکتا تھا۔ لیکن آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کو میری آواز اب بھی نہیں سنائی دیتی، کب سے حلق پھاڑ رہا ہوں۔ ... وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں اور پھر بے تعلقی سے منہ پھیر لیتے ہیں... خیر کبھی تو ... کبھی تو ... اوہو پتہ نہیں کیوں، اپنے یوم پیدائش کی بات نکلنے پر بے حد سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔

ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جب بھی یہ مصرعہ ذہن میں گونجتا ہے، ایک بھاری سی آواز اس پر حاوی ہو جاتی ہے "میاں کس کھیت کی مُولی ہو۔ تم نہ ہوتے تب بھی اُردو کو سری ادب کے اس دَور سے ضرور گزرنا پڑتا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد خواب دیکھنے والا کوئی مسلمان ایک کرنل فریدی ضرور پیدا کرتا۔ کرنل فریدی جو ساری دُنیا میں صرف قانون کی حکمرانی کا خواہاں ہے"

میں اس آواز کے جواب میں کہتا ہوں "اونہہ ... فراری ذہنیت کا ایک نمونہ میں نے بھی پیش کیا ہے۔ مجھے اس کا اعتراف

ہے، لیکن دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے۔ ہوائی قلعوں ہی نے اکثر ٹھوس حقائق کی طرف رہنمائی کی ہے۔"

لیکن یہ ابھی سے کرنل فریدی کہاں آ ٹپکے۔ ابھی تو میں اپنی تاریخ پیدائش بتا رہا تھا کہ اس کے بغیر "جنم کنڈلی" نہیں بن سکتی (میری صحیح تاریخ پیدائش کسی کو بھی یاد نہیں) لہٰذا اپنا مستقبل جنم کنڈلی کی مدد کے بغیر ہی بنانا پڑتا ہے۔

قصبہ نارہ ضلع الٰہ آباد یوپی میں ہوش سنبھالا۔ ابتدائی تعلیم قصبے ہی کے اسکول میں پائی۔ نصابی کتب کے علاوہ پہلی کتاب جو ہاتھ لگی وہ طلسم ہوشربا کی پہلی جلد تھی، ہرچند کہ اس کی زبان آٹھ سال کے بچے کے بس کا روگ نہیں تھی، پھر بھی کہانی تو پلے پڑ ہی گئی تھی سپلے درپے ساتوں جلدیں چاٹ ڈالیں . . . پھر یاد نہیں کتنی بار ساتوں جلدیں دہرائی گئی تھیں۔

پہلی کہانی اس وقت لکھی جب ساتویں درجے کا طالب علم تھا۔ اس کا نام "ناکام آرزو" تھا۔ یہ کہانی عادل رشید مرحوم نے اپنے ہفت روزہ رسالے "شاہد" میں شائع کی تھی۔

آٹھویں یا نویں درجے میں پہنچ کر شاعری شروع کی۔ حضرت جگر مراد آبادی حواس پر چھائے ہوئے تھے، لہٰذا خمریات میں طبع آزمائی ہوتی اور اس زور و شور سے ہوتی کہ کبھی کبھی سوچنا پڑتا کہیں سچ مچ تو نہیں پینے لگا۔ مثلاً:

ہمیں تو ہے بنتے گلِ رنگ وگل رُخاں سے غرض
بنائے کفِ پڑی کس طرح خدا جانے
بس اتنا یاد ہے اصرار وقت مے نوشی
کسی کی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے

یا

یہ تشنگی کے لئے خوشبو تھے تھے گلِ رنگ
اک رات میں ہو بونے پیرہن جیسے

میٹرک میں پہنچتے ہی بے بی کمیونسٹوں کا ساتھ ہو گیا۔ یہ ایسے بچہ لوگ تھے، جنہوں نے کبھی "پارٹی آفس" کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ کھدر پہنتے تھے اور گدڑی بازار (الہ آباد کی جونا مارکیٹ) سے آٹھ آٹھ آنے کی پرانی عینکیں خرید لاتے تھے اور کمیونسٹ کہلانے جانے کے شوق میں اچھی بھلی آنکھوں کا تیا پانچہ کر بیٹھتے تھے۔ بہرحال اُن کا ساتھ ہوتے ہی ظالم سماج اور "سرمایہ داری" میری شاعری میں گھس آتے تھے۔ ان دنوں محلے کے بنیئے کو سرمایہ دار سمجھتا تھا اور اپنی برادری "ظالم سماج" معلوم ہوتی تھی کیونکہ برادری سے باہر شادی کرنے پر سخت ترین پابندیاں عائد تھیں، لہٰذا اپنے ہی خاندان کے کچھ بزرگ سماج کے ٹھیکیدار ٹھہرے تھے اور دل ہی دل میں اُن پر غرا کر ظالم سماج کے خلاف شاعری کیا کرتا تھا اور جب محلے کا بنیا کسی قرض خواہ سے الجھ پڑتا تو سرمایہ داری کی شامت آجاتی۔ ایسی

دل ہلا دینے والی نظم لکھتا کہ بعد میں اُس بنیئے پر رحم بھی آنے لگتا۔
دوسری عالمگیر جنگ شباب پر تھی اور میں اس الجھن میں پڑا رہتا تھا کہ آخر عالمی امن کا داعی روس کیوں نازی جرمن کا ساتھ دے رہا ہے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک روس اور جرمن بھی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے اور میرے کھدر پوش ساتھیوں نے ہٹلر کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔
میں نے چپ چاپ اپنا کھدر کا سوٹ اتار کر ایک طرف رکھا۔ بال ترشوائے اور آدمی کی جون میں آگیا۔
انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا ہو چکا تھا۔ یودنگ کرسچین کالج الٰہ آباد کی رنگین فضاؤں میں کہ شہر کا واحد کو ایجوکیشنل کالج تھا، یہ ذوق پروان چڑھتا رہا
ہوسٹل میں شعر و سخن کی محفلیں جمتیں، لیکن فرسٹ ایئر کے سالانہ مشاعرے میں کچھ پڑھنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ سیکنڈ ایئر میں جب بزم ادب کی صدارت میرے حصے میں آئی تو کھل کر سامنے آنا پڑا۔
اس سال کے مشاعرے میں میری نظم "بنسری کی آواز" اس حد تک پسند کی گئی تھی کہ میرے ایک استاد مسٹر ہگنس نے جو انگریزی پڑھاتے تھے اور اردو شاعری سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے دوسرے دن کلاس میں کہا "فراق صاحب کی رباعیات اور "بنسری کی آواز" کے علاوہ مجھے تو اور سب کچھ شاعری کی بازگشت معلوم ہو رہا تھا۔"

صدر شعبۂ اُردو محترم مولانا الزار الحق صاحب نے فرمایا "میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ایک دن آپ کا شمار صفِ اوّل کے شعرا میں ہو گا"
(میں مولانا موصوف سے شرمندہ ہوں... وہ آج بھی میرے جاسوسی ناول نویس ہونے پر خوش نہیں ہیں)

۱۹۴۶ء میں یونیورسٹی پہنچا تو ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ اُن کے لیکچرز نے ذہنی نشو و نما کے نئے باب کھولے۔ فکر و نظر کی تہذیب کرنے کا سلیقہ پیدا ہوا، لیکن بدقسمتی سے یہ مدّت بہت قلیل تھی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو چکے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی خنجر زنی کی ایک واردات ہو گئی اور بزرگوں نے میرا یونیورسٹی جانا بند کرا دیا۔ پھر دوسرے سال دوبارہ داخلے کی ہمت اس لئے نہیں پڑی تھی کہ میرے ساتھی نورتھ ایئر میں پہنچ گئے تھے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں پرائیویٹ امیدواروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یو پی میں صرف آگرہ یونیورسٹی ایسے طلبا کا واحد سہارا تھی، لیکن شرط یہ تھی کہ امیدوار کو کسی ہائی اسکول میں معلّمی کا دو سالہ تجربہ ہونا چاہئیے۔ میں نے سوچا، چلو یہی سہی... دو سال تک لوگ ماسٹر صاحب ہی تو کہہ لیں گے۔ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر احساسِ کمتری کا شکار تو نہ ہونا پڑے گا۔ لہٰذا بی۔ اے آگرہ یونیورسٹی سے کیا تھا۔

اسی دوران میں ہم لوگوں نے الٰہ آباد سے ماہنامہ 'نکہت' جاری کیا جس کے مؤسس عباس حسینی تھے۔ شعبۂ نثر کی ادارت ابن سعید نے

سنبھالی اور حصّہ نظم میرے حصّے میں آیا۔ ۔ ۔ میں نے اس کے لئے طنزیہ مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔ یہ مضامین طغرل فرغان کے نام سے لکھے تھے۔

میں یہ سب کچھ کرتا رہا لیکن آٹھ سال کا وہ بچہ جس نے طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں چاٹ لیں تھیں کسی طرح بھی میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ شعر کہنے بیٹھتا تو سامنے آکھڑا ہوتا۔ نثر لکھتے وقت تو قلم ہی پر ہاتھ ڈال دیتا۔ ۔ ۔ اور پھر میں جھلا کر اس کے پیچھے دوڑ پڑتا۔ اس کا تعاقب کرتا ہوا طلسم ہوشربا کی فضاؤں سے گزرتا۔ ۔ ۔ اور بالآخر وہ مجھے رائیڈر ہیگرڈ کی غیر فانی "ہیّا" کے دربار میں پہنچا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے میری ساری نثری تخلیقات اُجاڑ ویرانوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں۔ بے چینی بڑھ جاتی بے اطمینانی کی حد نہ رہتی۔ پھر کیا کیا جائے، اکثر سوچتا۔ آخر سرّیت پسندی کے رجحان کی تسکین کیوں کر ہو؟۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ نے کہا۔ "اُردو میں صرف جنسی افسانوں کی مارکیٹ ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا۔"

میں نے کہا "یہ درست ہے لیکن ابھی تک کسی نے بھی جنسی لٹریچر کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔"

کسی طرف سے آواز آئی "یہ ناممکن ہے جب تک کوئی متبادل چیز

مقابلے میں نہ لائی جاتے۔ ۔ ۔ یہ قطعی ناممکن ہے۔"

متبادل چیز؟ میں نے سوچا اور پھر وہی آٹھ سال کا بچہ سامنے آ کھڑا ہوا، جس نے طلسمِ ہوشربا کی ساتوں جلدیں چاٹ ڈالی تھیں اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اسی سال کے بوڑھے بھی بچوں ہی طرح طلسم ہوشربا میں گم ہو جاتے ہیں۔

میں نے کہا "اچھی بات ہے، میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں۔" یہ ۱۹۵۱ء کے اواخر کی بات ہے۔ جب افسانوی ادب (بشمول ناول) میں افسانویت کے علاوہ اور سب کچھ بکثرت پایا جاتا تھا اور ناول میں "ناولٹی" مفقود تھی۔

میں نے اسی "ناولٹی" پہ زور دیتے ہوئے جاسوسی ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔

جنوری ۱۹۵۲ء میں میرے ہی مشورے پر ادارہ 'نکہت' نے ماہانہ جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سلسلے کا نام "جاسوسی دُنیا" تجویز ہوا۔ اب تک ایک سو اسی ناول لکھ چکا ہوں۔ اِن میں سے صرف آٹھ جزوی یا کُلی طور پہ انگریزی سے ماخوذ ہیں ورنہ سب طبع زاد ہیں۔

الٰہ آباد میں صرف سات ناول لکھے تھے۔ اس کے بعد اگست ۵۲ء میں کراچی آگیا تھا۔ بقیہ ناول یہیں لکھے۔ پھر ۵۶ء میں کراچی سے عمران سیریز کے ناول شروع کیے تھے۔

اکثر احباب کہتے ہیں "تم نے طغرل فرغان اور اسرار ناردی کو

قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ انہیں زندہ رکھا ہوتا تو آج "ادب العالیہ" میں تمہارا بھی کوئی مقام ہوتا۔"

میں ان سے کہتا ہوں "بھائی ادب العالیہ کی شمع جلاتے پانچ آدمیوں کے حلقے میں بیٹھا نظر آتا۔ ۔ ۔ یہی تو مقام ہوتا میرا ؟ یا اور کچھ ؟"

مجھ سے کوئی سلیم جعفری (ایک وسیع النظر صحافی اور باصلاحیت ٹی وی آرٹسٹ) یہ نہ کہتا کہ صفی صاحب اُردو میری مادری زبان نہیں ہے لیکن آپ جو یہ بامحاورہ اُردو مجھ سے سن رہے ہیں، آپ ہی کی کتب کے مطالعے کی رہینِ منت ہے۔"

سندھ اور بلوچستان اور صوبہ سرحد سے میرے پڑھنے والے مجھے ایسے ہی حوصلہ افزا خطوط بھی لکھتے رہتے ہیں۔

مجھے اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے اور پھر میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں اُسے کسی قسم کے بھی ادب سے کمتر نہیں سمجھتا۔ ہوسکتا ہے میری کتابیں الماریوں کی زینت نہ بنتی ہوں، لیکن تکیوں کے نیچے ضرور ملیں گی۔ ہر کتاب بار بار پڑھی جاتی ہے۔ میں نے اپنے لئے ایسے میڈیم کا انتخاب کیا ہے کہ میرے افکار زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچ سکیں۔ ہر طبقے میں پڑھا جاؤں اور بحمداللہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔ تھکے ہوتے ذہنوں کے لئے صحت مند تفریح مہیا کرتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ پڑھتے رہنے کی عادت ڈلواتی ہے۔ برصغیر میں ریڈنگ لائبریریوں کا

رواج میرے بعد ہی ہوا ہے۔ انہی لائبریریوں میں ادب العالیہ بھی کھپ جاتا ہے۔ جاسوسی ناول پڑھنے والوں کو جب کوئی ناول نہیں ملتا تو ادب العالیہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لہٰذا ادب العالیہ پر ناز کرنے والوں کو مجھ پر غارنہ کھانا چاہیئے، انہیں تو مجھ پر پیار آنا چاہیئے۔ ادب العالیہ کی رسائی عوام تک کرانے کا سہرا ابھی میرے ہی سر ہے۔

" بقلم خود" اتنا کچھ لکھ دینے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ اپنے بارے میں کچھ لکھنا بڑا جان جوکھم کا کام ہے۔ کہاں تک انانیت کو دبایا جا سکتا ہے۔ تھوڑی بہت لاف و گزاف بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میرا اپنا ہی خیال ہے کہ اپنے بارے میں گفتگو کرنے والے اوّل درجے کے بے وقوف ہوتے ہیں، لیکن مجھ سے یہ بے وقوفی سرزد' کرائی گئی۔ میں خود اس کا ذمّے دار نہیں ہوں۔

اچانک ابھی ابھی خیال آیا ہے کہ جب میں یہ مضمون برخوردار محمد اقبال کے حوالے کر رہا ہوں تو وہ کہیں نہایت سعادت مندی سے یہ نہ کہہ بیٹھیں۔
"جی آپ نہیں سمجھے! بقلم خود' کا مطلب دراصل یہ تھا کہ اس مضمون کی کتابت بھی آپ ہی کو کرنی پڑے گی "۔

اللہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔

• • • •

قابلِ اعتراض تصویر

آج میں کیپٹن حمید آپ سے مخاطب ہوں۔ اگر نہ ہوتا تب بھی یہ کہانی
آپ تک پہنچ جاتی۔ میں کیوں بیان کر رہا ہوں اس کا اندازہ بھی آگے
چل کر آپ کو ہو ہی جائے گا۔ آپ تو مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہوا
یہ کہ ایک دن مجھے بڑی ہی حیرت انگیز اطلاع ملی، ہائی سرکل کلب کے
حلقۂ احباب سے معلوم ہوا کہ ایک صاحبہ میرے "ظلم اور بے مروتی"
کی کہانی سناتی پھر رہی ہے۔ نام پوچھا تو میرے لئے بالکل نیا نکلا۔
میں اس نام کی کسی ایسی خاتون سے کبھی واقف نہیں رہا تھا... جو
جو میری بے وفائی کے تذکرے میرے احباب میں کر سکتیں۔ بہرحال
اشتیاق بڑھا۔ اسی شام ہائی سرکل جا پہنچا اور ایک بے تکلف دوست
کی وساطت سے انہیں دور سے دیکھنے کا شرف بھی حاصل کیا۔ وہ
توقعات سے کچھ زیادہ ہی خوبصورت نکلیں۔ گداز جسم اور موزوں

قدو قامت کی خاتون تھیں۔ چہرہ بھی دلکش تھا۔ عمر ستائیس، اٹھائیس
سال سے زیادہ نہ رہی ہو گی۔ ان کے چہرے کی دلکشی کا باعث،
دراصل ان کی مغموم آنکھیں تھیں اور ان کی پوری شخصیت ان آنکھوں
ہی کے تابع محسوس ہوتی تھی۔ ایسا جیسے میر کا کوئی نازک سا شعر
انسانی پیکر اختیار کر کے آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو۔
میں نے مصلحتاً اپنے دوست سے کہہ دیا کہ ہاں میں ان سے کسی
قدر واقف ہوں اور ان محترمہ کے سامنے آئے بغیر وہاں سے رخصت
ہو گیا۔ ذہن پر بہت زیادہ زور دینے کے باوجود بھی یادداشت کا
کوئی گوشہ ان کے متعلق روشنی میں نہ آ سکا۔ پھر کیا چکر ہے، میں
نے سوچا . . . تھوڑی دیر بعد مجھے پھر ہاتی سرکل ہی میں واپس
آنا پڑا، لیکن معمولی قسم کے میک اپ میں۔ شہزادہ صاحبہ اب بھی
اسی ٹیبل پر موجود تھیں۔ ان کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ کافی کے
خالی برتن میز پر رکھے ہوئے وہ کسی رسالے کا مطالعہ فرما رہی تھیں۔
میں نے اپنے لئے ان کے قریب ہی ایک میز منتخب کی صورت
سے نیک سیرت ہی لگ رہی تھیں، وہ محترمہ . . . میں اُن کے بارے
میں کوئی بُری بات نہ سوچ سکا لیکن آخر اس فراڈ کا کیا مطلب تھا
مجھے خواہ مخواہ کیوں بدنام کرتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں
ان کی پھیلائی ہوئی افواہوں سے متاثر ہو کر اُن کا تعاقب شروع کر
دیتا۔ ممکن ہی نہیں تھا بلکہ یہ میرا فطری ردِ عمل ہونا چاہیئے تھا۔

چلیئے میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ پھر؟ . . . کچھ نامعلوم آدمی ان محترمہ کو چارا بنا کر مجھے شکار کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب میرے لاشعور نے اثبات ہی میں دیا اور پھر میں نے کہا دیکھ ہی لینا چاہیئے اس معاملے کو بھی . . .

کچھ دیر بعد وہ اُٹھ گئیں۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ باہر آکر انہوں نے ایک ٹیکسی رکوائی اور وہاں سے روانہ ہوگئیں۔ اس بار میں اسکوٹر لے کر آیا تھا۔ لہٰذا تعاقب جاری رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اُس کی ٹیکسی . . . ہوٹل ڈی فرانس کے سامنے رکی تھی اور میں نے تعاقب جاری رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں رفیعہ شہزاد کے نام سے مقیم ہیں۔ اس تعاقب کے دوران میں میں نے کئی ایسے طریقے اختیار کئے تھے جن سے ظاہر ہو جاتا کہ میں اس عورت کا تعاقب کر رہا ہوں لیکن خود میں نے کسی بھی جگہ محسوس نہیں کیا تھا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں زیادہ محتاط آدمی نہیں ہوں۔ سوچ بچار ضرور کرتا ہوں لیکن اس قدر بھی نہیں کہ سوچ بچار ہی کرتا رہ جاؤں بس تھوڑا سوچا اور لگ گئے کام سے۔ اتنی تاب کہاں ہے کہ کسی معاملے سے الگ رہ کر اس کے مزید روشنی میں آنے کا انتظار کر سکوں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر تھوڑی ہی دیر بعد اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے بیٹھا۔

دروازہ پورا کھلنے پر وہ سامنے کھڑی نظر آئی، شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہن کر اس کی ڈوری کس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار دیکھ کر میں نے کہا "تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں، لیکن ضروری بات ہے!"

اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا "اندر تشریف لائیے"

اندر پہنچ کر میں نے خود ہی ایک کرسی کھینچ لی، اس کا کہنے کا منتظر نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے اب بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھے جارہی تھی "آپ بھی بیٹھ جائیے" میں نے اس سے کہا۔

"جج... جی شکریہ" وہ بستر پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "مم... میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"پہچاننا آپ کے لئے ضروری نہیں جبکہ جان پہچان کے بغیر ہی آپ دوسروں سے متعلق افسانے تراش سکتی ہیں"

"اوہ... کیپٹن حمید..." وہ اُچھل کر کھڑی ہوگئی۔

"اگر میں کیپٹن حمید ہوں تو آپ کی پھیلائی ہوئی کہانیاں کس حد تک سچ ہوسکتی ہیں" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپ نہیں ہیں!" دفعتہً اس کی آواز کمزور پڑگئی۔

"پہچاننے کی کوشش کیجیے"

"میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کیپٹن حمید ہیں یا نہیں؟" اس نے کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا۔

"جی نہیں!"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" وہ مضمحل آواز میں بڑبڑائی۔

"آپ کیا نہیں سوچ سکتی تھیں؟"

"کچھ نہیں... براہ کرم یہاں سے تشریف لے جائیے!"

"لیکن محترمہ آپ جواب دہی سے نہیں بچ سکیں گی" آپ نے پولیس آفیسر کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے محکمے میں عشق و محبت اور سوز و گداز وغیرہ نہیں چلتے۔ اگر آپ ناکام محبت ہیں اور کیپٹن حمید نے آپ سے بے وفائی کی ہے تو یہ اس کا نجی معاملہ ہے۔ اسے بدنام کرکے آپ اس کی پوزیشن کو متزلزل نہیں کر سکتیں۔ وہ ایک کھلنڈرا آدمی ہے، سب اس سے واقف ہیں۔ اس کے ماتحت بھی اور اس کے افسر بھی...!"

"وہ قطعی کھلنڈرا آدمی نہیں۔" رفیعہ تلخ لہجے میں بولی" ورنہ تمہیں بھیجنے کی بجائے خود آتا۔"

"بھلا وہ کیوں آتا جبکہ آپ اسے پہچانتی تک نہیں"

"آپ ہیں نا...؟"... اللہ بتا دیجئے...!" یک بیک وہ ٹھنکی۔

"فرض کیجئے میں ہی ہوں تو پھر؟"

"مجھے اس پر یقین ہونا چاہیئے کہ آپ ہی ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی۔

آخر کچھ دیر بعد یقین دلا ہی دینا پڑا کہ میں ہی کیپٹن حمید ہوں۔
"میں نے سنا ہے کہ آپ ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اور ان کے معاملات کو اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔"
میں نے اسے بتایا کہ اس نے غلط نہیں سنا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر غمگین آواز میں بولی "آپ کے سلسلے میں مجھے بھی بہت زیادہ سراغ رسانی کرنی پڑی ہے" اور اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی "یہ پتہ لگانا کہ آپ کن حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں اور کہاں کہاں آپ سے متعلق اس قسم کی گفتگو کرنا مناسب ہوگا، مشکل کام تھا۔"
"میں کہتا ہوں کہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ براہِ راست مجھ تک پہنچ کر کسی بھی معاملے میں مدد کی طالب ہوسکتی تھیں۔"
"میں بہت دشواری میں پڑگئی ہوں۔ اس شہر میں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا۔"
"آپ دشواری بیان کیجیے!"
"دشواری بیان نہیں کرسکتی! سب کچھ آپ کے حوالے کر کے آپ کو معاملات کی نوعیت کا اندازہ کرنے کی مہلت دوں گی۔"
"کیا حوالے کر کے؟"
"ٹھہریئے!" وہ اٹھتی ہوئی بولی۔ اس کے بعد اس نے مسہری کے نیچے سے ایک سوٹ کیس نکالا اور اسے کھولنے لگی۔ میں سوٹ کیس کی طرف سے توجہ ہٹا کر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ سوٹ کیس بند

کر کے وہ میرے قریب آئی اور ایک لفافہ میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔
"اسے آپ یہاں میری موجودگی میں نہیں دیکھ سکتے۔ جیب میں رکھ لیجئے۔
کہیں اور جاکر دیکھئے گا۔"
"بڑی عجیب بات ہے۔" میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لفافہ بند تھا اور اس پر کسی قسم کی تحریر
نہیں تھی۔ دفعتاً وہ میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی مسکرائی اور بولی۔
"سراغ رساں صاحب! اس لفافے میں ٹائم بم تو ہو نہیں سکتا۔ براہ کرم
اسے احتیاط سے جیب میں رکھ لیجئے۔ گھر جاکر دیکھئے گا کہ آپ میرے
لئے کیا کر سکیں گے، اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔"
"تو اب میں جاؤں؟" میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا اور اس
نے بھی بے وقوفوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔
"جی ہاں!"
. . . اور آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ میں چپ چاپ
اُٹھ کر چلا آیا تھا۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی کہ میں نے راستے میں کہیں
رک کر اس لفافے کو کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سیدھا گھر ہی آیا
تھا۔ اس لفافے میں اس کے بیان کے مطابق ٹائم بم نہیں تھا لیکن
مجھ جیسے آدمی کے لئے وہ چیز ہائی ایکسپلوسیوبم سے کسی طرح کم ثابت
نہ ہوسکی۔ یہ ایک فوٹوگراف تھا۔ اس میں رفیعہ شہزاد اور ایک مرد
قابلِ اعتراض ہی نہیں بلکہ ناگفتہ بہ حالات میں نظر آتے۔ اس نزدر

کا غصہ آیا کہ بس کیا بتاؤں۔ پھر خیال آیا کہ تصویر کے ساتھ کچھ کاغذات بھی تو ہیں، انہیں بھی دیکھا جاتے اگر ان میں بھی لغویات نظر آئیں تو جی بھر کر خفا ہو لیا جائے گا۔
یہ کئی صفحات پر مشتمل ایک تحریر تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ فوٹو حقیقی نہیں تھے لیکن شریک مرد اس کے لئے اجنبی بھی نہیں ہے اور وہ اس کا مرحوم چچازاد بھائی ہے اور اس کے لئے اتنا ہی محترم تھا جتنا سگا بھائی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں نے کچھ عرصہ لندن میں ایک ساتھ گزارا تھا۔ اب جبکہ وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اسے یہ تصویر اس دھمکی کے ساتھ موصول ہوئی ہے اگر اس نے اپنا ارادہ نہ بدلا تو اس تصویر کی ایک کاپی متعلقہ آدمی کو بھیج دی جائے گی۔ آخر میں شہزاد نے لکھا تھا:۔
"اس تصویر کو آپ تک پہنچا دینے کے بعد پھر آپ سے آنکھیں ملانے کی جرأت خود میں نہیں کر پاتی، لیکن بہر حال مجھے اس پریشانی سے نجات حاصل کرنی ہے۔ خدارا کچھ کیجئے۔ میں ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں کہ یہ تصویر فوٹو گرافی کی بازی گری کے علاوہ اور کوئی اصلیت نہیں رکھتی۔ ہم دونوں کے سر انجانے جسموں سے جوڑ دیئے گئے ہیں۔"
اس کے بعد اس نے لاکھوں منتوں اور سماجتوں کے ساتھ لکھا تھا کہ اس بلیک میلر سے اسے نجات دلائی جائے۔ میں نے لفافہ

جیب میں ڈال لیا۔ کرنل صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ اس لئے بڑے اطمینان سے تجربہ گاہ میں کام کر سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں، میں نے رفیعہ کے بیان کی تصدیق کر لی۔ تصویر حقیقتاً بنائی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس کا نیگٹو کسی پازیٹو سے بنایا گیا تھا۔ میں نے ہوٹل ڈی فرانس سے فون پر رابطہ قائم کر کے رفیعہ کے کمرے میں کنکٹ کرایا اور اسے اطلاع دی کہ میں یقیناً اس کی مدد کروں گا کیونکہ تصویر سے متعلق اس کا بیان صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے' اس نے جواب میں میرا شکریہ ادا کر کے مزید کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا حالانکہ میں ابھی اس سے کچھ دیر باتیں کرنا چاہتا تھا۔

دوسری صبح میں پھر ہوٹل ڈی فرانس جا پہنچا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھی۔ کاؤنٹر پر معلوم ہوا کہ وہ ایک گھنٹہ پہلے اپنا حساب صاف کر کے کمرہ خالی کر گئی ہے۔ بات پلے نہ پڑی۔ وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھ کر واپس گھر آیا۔ کرنل صاحب دفتر جا چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا۔ ان سے اس واقعے کا تذکرہ کروں یا نہ کروں . . . ! تصویر اور تحریر میرے قبضے میں تھی۔ آخر وہ اس طرح غائب کیوں ہو گئی ؟ اگر اس کی کہانی سچی تھی تو ابھی اسے اور بھی بہت کچھ بتانا تھا۔ محض کہانی کی حد تک تو کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں کس کے گریبان میں ہاتھ ڈالتا۔ دوسرا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا کہ اس کا تذکرہ کرنل سے کیا جائے یا نہیں۔

شام کو پھر میں نے ہائی سرکل نائٹ کلب کی راہ لی۔ میں ان لوگوں

سے اس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا جن کے ساتھ وہ اٹھتی بیٹھتی رہی تھی۔ وہ مجھے ان کے درمیان موجود ملی لیکن میں نے اس میز کی طرف جانے کی بجائے اپنے لئے ایک خالی میز منتخب کی۔ رفیعہ شہزاد کے علاوہ اس میز کے اور سب لوگ مجھے گھور رہے تھے، وہ بھلا کیوں کر متوجہ ہوسکتی تھی۔ میں پچھلی رات والے میک اپ میں تو تھا نہیں۔ میری اصلی شکل میں تو وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکتی تھی۔ میں منتخب کی ہوئی میز پر جانے کے لئے ان کے قریب سے گزر ہی رہا تھا کہ بیگم نوشاد نے "ہلو کیپٹن" کہہ کر مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ میں رک گیا۔ میں نے سوچا رفیعہ کی آزمائش کے لئے ایک موقع اور ہاتھ آیا۔ بیگم نوشاد نے کہا کہ میں بھی انہیں کے ساتھ بیٹھوں اور ویٹر کو اشارہ کرکے ایک کرسی اور منگوائی۔ دوسروں کو اپنی کرسیاں کھسکا کر میرے لئے جگہ بنانی پڑی۔ میں نے رفیعہ کی طرف دیکھا وہ بے تعلقانہ انداز میں بیٹھی رہی۔ بیگم نوشاد کبھی میری طرف دیکھتی تھی اور کبھی رفیعہ کی طرف۔ دفعتہً انہوں نے کہا۔

"اب یہ بے تعلقی ختم ہونی چاہئیے"

میں نے سوچا کھیل بگڑ جائے گا لہٰذا جلدی سے بول پڑا "بے تعلقی میری طرف سے نہیں ہے بیگم نوشاد۔ رفیعہ نے خود ہی مجھے ٹھکرایا تھا!" وہ چونک کر مجھے گھورنے لگی، میں نے مسکرا کر کسی قدر تلخ لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی "آپ خود دیکھئے ان کی آنکھوں میں کتنی اجنبیت ہے جیسے پہلی بار دیکھا ہو، حالانکہ کیپٹن حمید کو اگر کسی نے ایک بار بھی دیکھا

ہے تو وہ اُسے بھلا ہی نہیں سکتا۔"

"آخر جھگڑا کیوں ہوا تھا ؟" بیگم شمشاد نے پوچھا۔

"اب جبکہ یہ مجھے بُرا بھلا کہتی پھر رہی ہیں۔ مجھے بھی کچھ کہہ دینا چاہیے ہم بڑے اچھے دوست تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ ڈیڈی میری شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ بڑا اسکی آدمی ہے۔ اس لئے اب ہم نہیں ملیں گے، میں نے کہا ٹا ٹا۔ . . میرے نکتہ نظر سے دوسری بار تو پیدا ہونا نہیں ہے کہ ایک ہی دوستی پر اکتفا کئے بیٹھا رہوں، دوستی ایک ہمہ گیر جذبہ ہے اور کسی ایک کے لئے مخصوص نہیں۔ میں مٹی کے ڈھیر سے دوستی کر کے نبھا سکوں گا۔" میں نے دیکھا کہ رفیعہ کے چہرے پر مردنی چھا گئی ہے، اس لئے جلدی سے بولا، اگر یہ دوستی کا رشتہ دوبارہ قائم کرنا چاہتی ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پھر میں نے اٹھ کر رفیعہ کا ہاتھ پکڑا اور بے تکلفانہ انداز میں بولا "آؤ چلیں۔" وہ کسی سحر زدہ کی طرح اٹھ گئی تھی۔ میں ان سبھوں کو متحیر چھوڑ کر اسے ساتھ لئے ہوئے باہر آگیا۔ آج لنکن تھی میرے پاس، میں نے اگلی سیٹ کا دروازہ رفیعہ کے لئے کھولتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ، بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"مم . . . مگر . . . میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" وہ ہکلائی۔

"کیپٹن حمید ـــ جس نے آپ سے بے وفائی کی تھی۔"

"لل... لیکن... !"

"چلو بیٹھ جاؤ۔ پچھلی رات میں میک اپ میں تھا۔ کیا تم آواز تک بھی نہیں پہچان سکتیں؟" پھر میں بھی بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "صبح سے تمہاری تلاش میں تھا"۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی مطمئن نہیں ہے "تصویر کے بارے میں۔ میں تمہیں رات ہی اطلاع دے چکا ہوں"

"جی ہاں، اور اب اس کا تذکرہ نہ کیجئے"

"اب بتائیے! کوئی ایسا آدمی ہے، جس پر آپ شبہ کر سکیں"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

"کہیں بھی نہیں۔ میں نے تو آپ کو وہاں سے اس لئے اٹھایا تھا کہ کچھ دیر گفتگو رہے اور اس کے لئے گاڑی زیادہ مناسب جگہ نہیں۔ ویسے اگر تم کہیں چلنا چاہو!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا" اس نے کہا۔ بہت نروس معلوم ہو رہی تھی! تھوڑی دیر گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ ہوٹل ڈی فرانس میں کسی شناسا کو دیکھ کر اس نے فوری طور پر وہاں کی رہائش ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مزید پوچھ گچھ پر وہ شخص اس کا قریبی شناسا ثابت ہوا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے شہر میں اس کی موجودگی کا علم ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ گاڑی ہی میں بیٹھی رہے اور خود نیچے اتر گیا۔ اندر کاؤنٹر پر

اس کے شناسا کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ وہ کمرہ بیاسی میں مقیم تھا۔ تصدیق کرکے میں واپس آگیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ ہم پھر چل پڑے۔ اس نے بتایا کہ وہ اب گرینڈ میں مقیم ہے، میں نے کہا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں اس کی مدد کردوں تو مجھے اطلاع دیئے بغیر رہائش تبدیل نہ کرے۔ گرینڈ تک پہنچتے پہنچتے میں نے اس سے بہت سی باتیں کر ڈالیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایسی باتوں کا جواب دینے سے گریزاں ہے، جن سے اس کی شخصیت یا خاندان پر روشنی پڑسکتی۔

بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ بہتیری ضروری معلومات حاصل کئے بغیر اس سلسلے میں کام کا آغاز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو مشتبہ آدمیوں کی فہرست تیار کرنی پڑتی۔ پھر یہ دیکھنا پڑتا کہ ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے، جو اس حد تک جاسکے۔ میں نے . . . اُسے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کرکے گرینڈ کے قریب اتار دیا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں وہ تصویر کرنل صاحب کی خدمت میں پیش کر دوں اور اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں جب تک کہ وہ مجھے قتل کر دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

شامت میری منتظر تھی! وہ شاید خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے تصویر ان کی طرف بڑھا دی۔ اچٹتی سی نظر ڈالی اور میرا ہاتھ جھٹکتے ہوتے بولے "یہ کیا بیہودگی ہے؟"

تصویر میرے ہاتھ سے گر گئی تھی اور وہ آگے بڑھ گئے تھے۔

پھر میں تصویر اٹھا ہی رہا تھا وہ دوبارہ پلٹ آئے۔ اب جو میں تصویر اٹھا کر سیدھا ہوا تو ان کی خونخوار نظروں سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے مجھے اس طرح گھورتے ہوئے تصویر میرے ہاتھوں سے جھپٹ لی۔ اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں کھڑا احمقوں کی طرح انہیں دیکھتا رہا۔ اب وہ اس طرح اس تصویر کو گھور رہے تھے، جیسے ان دونوں میں سے کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"اگر میں تمہارا خیال کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم میرے منہ پر تھوکنے کی کوشش کرو۔"

ان کا لہجہ عجیب تھا اور میرے لئے نیا بھی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی! چھٹی حس نے کہا بات کو طول نہ دو۔ لہٰذا لفافہ بھی میں نے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ ایک کیس ہے۔ تحریر دیکھ لینے کے بعد ہی میرے متعلق کوئی رائے قائم فرمائیے گا۔"

وہ لفافہ میرے ہاتھ سے لے کر تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی خواب گاہ کی طرف چلے گئے۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا اور پھر تھوڑی دیر بعد مجھ پر دوسرا بم گرا تھا۔ میری خواب گاہ کے فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کرنل صاحب ہی کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں طلب کر رہے تھے۔ کمرے میں پہنچا تو وہی تصویر ان کے ہاتھ میں تھی اور ایک البم سامنے میز پر کھلا پڑا تھا۔

"تمہارے بیان کے مطابق وہ لڑکی گرینڈ ہوٹل میں مقیم تھی، لیکن کمرہ نمبر تیرہ سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی غصیلے انداز میں کہا اور ٹیلی فون کو گھورنے لگے۔

میں نے کہا "میں ٹرائی کرتا ہوں۔" لیکن مجھے بھی آپریٹر نے وہی جواب دیا کہ کمرہ نمبر تیرہ سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔۔۔

"میں چلوں گا۔ کپڑے پہنو!" کرنل صاحب مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

ہم گرینڈ پہنچے اور سیدھے کمرہ نمبر تیرہ کی طرف بڑھتے چلے گئے، پتہ نہیں کیوں کرنل نے کاؤنٹر پر رُک کر کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کمرے کے سامنے جاکر رکے۔ دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ پورا کمرہ تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا اور وہ سامنے ہی مسہری پر سو رہی تھی۔ کرنل نے دروازہ بند کر دیا اور ہم دروازے کے قریب ہی کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ دفعتاً کرنل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "وہ مر چکی ہے اور تم خطرے میں ہو۔"

میں بوکھلاہٹ میں مسہری کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ واقعی مر چکی تھی اور شاید اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ میں نے کمبل اٹھانا چاہا لیکن کرنل نے ہاتھ اٹھا کر اس سے باز رکھا اور مجھے کمرے سے نکال لائے۔ اس سے پہلے انہوں نے تیز روشنی والا بلب بجھا کر گہری نیلی روشنی والا بلب روشن کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ مجھے بدنام کرتی رہی تھی اور آج شام کو میں کئی لوگوں کے سامنے اسے سرکس

سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تنکن میں بیٹھتے ہوتے میں نے کرنل سے اپنی الجھن کا تذکرہ کیا۔ وہ سرد لہجے میں بولے۔" اسی لئے یہ ضروری ہے کہ لاش دریافت ہونے سے قبل ہی ہم قاتل پر ہاتھ ڈال دیں۔"

" ق —— قاتل —— اسے ہم کہاں تلاش کریں گے ؟"

" تم نے ہوٹل ڈی فرانس میں اس کے کسی شناسا کا تذکرہ کیا تھا ؟"

" ہاں میں نے تصدیق کی تھی۔ کمرہ نمبر بیاسی میں طارق سعید نام کا ایک آدمی مقیم ہے۔"

" طارق سعید !" کرنل صاحب کی آواز میں دبا دبا سا جوش بھی شامل تھا۔ میں چونک کر ان کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ہم ہوٹل ڈی فرانس پہنچے۔ . . رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ آج سردی بھی کسی قدر زیادہ ہی تھی۔ ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل کے کوریڈور میں پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے ایک آدمی آتا نظر پڑا۔ اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور فیلٹ کا گوشہ پیشانی پر اس طرح جھکا رکھا تھا جیسے مقصد ہی چہرہ چھپانا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ کرنل نے اپنی رفتار کم کر دی ہے۔ اور جیسے ہی وہ آدمی قریب سے گزرا کرنل ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔" اوہ انکل" وہ ایک جھٹکے کے ساتھ رکا تھا، ساتھ ہی فیلٹ ہیٹ کا گوشہ بھی اوپر کر لیا تھا۔ میں نے ایک جھینپا جھینپا سا قہقہہ سنا۔ جس میں اعصابی تشنج کے اثرات بھی شامل

تھے۔

"کیا یہ ظلم نہیں ہے انکل کہ آپ یہاں آکر ہوٹل میں قیام کریں...!"
کرنل پھر بولے۔

"بھئی کیا بتاؤں کمال میاں! ایسی مصروفیات ہوتی ہیں کہ کسی کے مہمان بننے کو جی نہیں چاہتا۔" کرنل کے انکل نے کہا — یہ ادھیڑ عمر کے ایک توانا اور صحت مند آدمی تھے۔

"ابھی اور اسی وقت آپ میرے ساتھ چلیں گے۔" کرنل بولے۔

"مم — مگر۔ میں تو ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔"

"کچھ بھی ہو مگر ایک روز میرے ساتھ ضرور قیام کریں گے؟"
کرنل صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر لفٹ کی طرف لے جاتے ہوئے بولے

لفٹ میں بھی ان کے انکل انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ اسی ٹرین سے ان کی واپسی بے حد ضروری ہے۔ لنکن میں بیٹھتے ہوتے کرنل نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "قریبی عزیزوں میں آپ کے علاوہ اب اور کون ہے جسے اپنا کہہ سکوں اور آپ ہیں کہ سامنا ہو جانے پر بھی دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے بھتی... خیر!" انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔
گویا انہوں نے کرنل کی ضد کے سامنے ہار مان لی تھی۔

"بس اب یہاں سے گھر چلیئے۔ فی الحال میں اپنا وہ کام بھی

ملتوی کرتا ہوں جس کے لئے یہاں آیا تھا۔"

"کس کام سے؟"

"آپ میرے پیشے سے واقف ہی ہیں۔"

"اوہو۔ کوئی خاص بات"

"ہاں ۔۔۔ آں ۔۔۔ ہوتا ہی رہتا ہے۔ کچھ نہ کچھ۔"

تھوڑی دیر بعد لنکن کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ آخر کرنل صاحب جیسے بااصول آدمی نے ایک اہم معاملے کو کھٹائی میں ڈال کر اقربا نوازی کا چکر کیوں چلا دیا، لیکن میں کچھ نہ بولا۔ رفیعہ شہزاد یہاں اجنبی تھی۔ صبح اس کی لاش ملے گی کیونکہ یہاں اجنبی تھی، لہٰذا شناخت نہ ہو سکنے کی بنا پر لاش کے فوٹو بھی اخبارات میں شائع کئے جا سکتے ہیں اور یہ چیز کم ازکم میرے حق میں بہت مضر ثابت ہوتی۔ اگر وہ دوسروں سے بھی میرے متعلق گفتگو نہ کرتی رہی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ میں سوچتا رہا اور بور ہوتا رہا۔ کرنل نے پھر اس کے بارے میں کوئی گفتگو ہی نہ کی۔ اپنے "انکل" سمیت مہمان خانے میں چلے گئے تھے۔

میری آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ خواب گاہ میں ٹہلتا رہا۔ دو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کرنل بول رہے تھے۔ فرمانے لگے۔ "انکل کو نیند نہیں آ رہی۔"

سخت تاؤ آیا، گویا میں یہی معلوم کرنے کے لئے بے خوابی کا شکار

ہو رہا تھا "خدا انہیں دائمی سکون عطا کرے" میں نے جل کر کہا۔
"وہ تصویر میری خواب گاہ میں سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ہے۔ اُسے لے کر کیفے وکٹوریہ چلے جاؤ . . . اس کا منیجر تمہارا منتظر ہے۔ وقت کم ہے جلدی کرو، میں اسے پہلے ہی فون کر چکا ہوں" پھر مزید کچھ کہے بغیر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میں کیا کرتا لیکن اس وقت تو وہی کرنا تھا جو کچھ کہا جاتا۔
کیفے وکٹوریہ کا منیجر مجھے اُن لوگوں سے ملاتا پھرا جو اس قسم کی تصاویر کا بیوپار کرتے ہیں۔ میں انہیں اپنے پاس والی تصویر کے چہرے چھپا کر صرف پوز دکھاتا اور ان سے معلومات حاصل کرتا۔ دو گھنٹے کی دوا دوش کے بعد ایک بیوپاری ایسا ملا جس نے بتایا کہ پندرہ دن قبل اسی پوز کی ایک صد کاپیاں اس کے پاس تھیں لیکن ایک آدمی ساری خرید لے گیا تھا اور یہی نہیں اسی پوز کی مزید تصاویر کے لئے اس نے اس کا پورا اسٹاک کھنگال ڈالا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس آدمی کو شناخت کر سکے گا۔ میری دانست میں یہ کام کی بات تھی۔ اس سے پہلے جن آدمیوں سے ملا تھا۔ ان کے پاس اس پوز والی تصاویر سرے سے تھیں ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم بھی مختلف جگہوں پر تلاش کرتا ہوا اس بیوپاری تک پہنچا ہو۔
واپسی پر ساڑھے چار بج چکے تھے۔ کرنل صاحب ڈرائنگ روم میں موجود تھے اور ان کے انکل کسی مسئلے پر دل کھول کر بولے جا رہے

تھے۔ کرنل کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی برخوردار اپنے کسی بزرگ کے پند و نصائح کان دھر کر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میز پر کافی کا سامان چنا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئے اور کرنل نے پلٹ کر پوچھا "کیا رہا؟"

میں نے پوری رُوداد سُنائی اور کرنل پُر تفکّر انداز میں سر ہلاتے رہے۔ "کافی پیو! اور ہمارے لئے بھی بناؤ۔" کرنل نے اس مسئلے پر اظہارِ خیال کی بجائے کہا۔

"مم —— میں اب نہیں پیئوں گا۔ میری طبیعت کچھ بگڑ رہی ہے۔" انکل بولے۔

"اوہ۔ . . خیر! حمید میرے لئے انڈیلو۔"

"مَیں پچھلے چھ ماہ سے بے خوابی اور اختلاجِ قلب کا مریض ہوں۔" انکل نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو کیا اس وقت اختلاجی کیفیت محسوس کر رہے ہیں آپ۔" کرنل نے پوچھا۔

"ہاں"

"اوہ۔ . . تب تو آپ کو صرف تفریح کرنی چاہیئے۔" انکل صرف کرنل کو دیکھتے رہے۔ کچھ بولے نہیں۔ ہم دونوں نے کافی کا ایک ایک کپ پیا اور کرنل اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلیئے . . . . آپ کو اختلاج ہو رہا ہے تو کہیں چلتے ہیں۔"

انہوں نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ ۔ ۔ اب اس وقت۔ ۔ ۔ ارے لو پانچ بج گئے "

"چلیئے بھی اس وقت کی ہوا اختلاجِ قلب کے مریضوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کرنل کو ہو کیا گیا ہے۔ انہوں نے بالآخر اپنے انکل کو ہوا خوری کے لئے مجبور کر ہی دیا اور ہم لنکن پر آبیٹھے۔ کرنل خود ہی ڈرائیو کر رہے تھے اور انکل کو انہوں نے اپنے پاس ہی بٹھایا تھا پتہ نہیں کس زمانے کی باتیں چھیڑ کر ان کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ بیک وقت کتنے کام کر سکتا ہے یہ شخص۔ کیس کی تفتیش ہو رہی ہے اور ایک رشتہ دار کو انٹرٹین بھی کیا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں اختلاج زدہ انکل قہقہے لگانے کے قابل ہو گئے تھے بہرحال مجھے ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ اب دو تین گھنٹوں کے بعد رفیعہ شہزاد کی لاش برآمد کرلی جائے گی اور میں دشواریوں میں پڑ جاؤں گا۔ میں اُس بُری طرح ان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ گرد و پیش کا احساس ہی نہ رہا۔ اسی وقت خیال کے تانے بانے ٹوٹے تھے، جب کار رکی تھی۔ کرنل گاڑی سے اترتے ہوتے انکل سے بولے۔ "اتریئے۔"

"کک ۔ کیوں ۔ کہاں ہے!!"

"گرینڈ ہوٹل ہے۔ ذرا ایک صاحبہ سے ملتا چلوں۔ وہ بیمار تھیں!"

"صص ۔۔ صاحبہ؟"

"جی ہاں ۔۔۔ ایک ملنے والی ہیں، کمرہ نمبر تیرہ میں" گرینڈ اور کمرہ نمبر تیرہ کے حوالے پر میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ انکل بولے "تم ہو آؤ۔ میں یہیں بیٹھا ہوں"

" اختلاجی کیفیت میں آپ کو تنہا کیسے چھوڑا جا سکتا ہے" کرنل کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا تم میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہو" دفعتاً انکل کا لہجہ بدل گیا۔

" میں آپ کو کمرہ نمبر تیرہ میں ضرور لے جاؤں گا"

"کیا بیہودگی ہے؟"

"میں تو ضرور لے جاؤں گا"

"تم بکواس کرتے ہو"

"آپ چچا ہیں میرے۔ سخت سست کہنے کا حق حاصل ہے آپ کو، لیکن اس کے باوجود آپ کو چلنا پڑے گا"

"خاموش رہو"

دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ ہماری گاڑی کے قریب تین چار آدمی اور بھی موجود ہیں" انہیں کمرہ نمبر تیرہ میں لے چلو!" کرنل نے ان سے کہا۔

"او۔کے سر"۔ ان میں سے ایک آدمی بولا اور انکل کا ہاتھ پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ" اب انکل کی آواز میں خوفزدگی کے آثار تھے۔

"لے چلو" کرنل غرآئے۔ ان کے لہجے کی تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، انکل گھسیٹے جا رہے تھے، اور بھتیجے صاحب اس واردات پر اتنے مطمئن اور آسودہ نظر آ رہے تھے، جیسے بزرگوں کی خدمت کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کر بیٹھنے کا شرف حاصل ہو گیا ہو۔

"میں نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گا" دفعتاً انہوں نے ہذیانی انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔

"ہتھکڑیاں لگا دو ـــــ" کرنل پھر غرآئے اور بلند آواز میں بولے۔ "طارق سعید میں تمہیں ایک نامعلوم عورت کو قتل کر دینے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں"

"مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔ ۔ ۔" انکل چیخ رہے تھے اور مجھ پر کسی حد تک بوکھلاہٹ کا دورہ پڑ چکا تھا۔

●

اس طرح لاش دریافت ہونے سے قبل ہی ملزم ہاتھ آگیا تھا۔ اور میں نے اطمینان کی سانس لی تھی، لیکن ذہن بدستور الجھا ہوا تھا۔

آخر یہ سب ہوا کیسے ؟ شام تک کرنل سے ملاقات نہ ہو سکی! بہرحال انہوں نے پہلی اطلاع یہی دی تھی کہ مجرم نے اعترافِ جرم کر لیا ہے۔

"یہ احمق" کرنل سگار سلگاتے ہوئے بولے "جب بھی کسی جرم کی اسکیم بناتے ہیں تو وہ زیادہ تر خواب دیکھتے رہتے ہیں، جس کے خلاف جرم کرتے ہیں اس کی نفسیات کا قیاس بھی خود پر ہی کرتے ہیں اور پھر پتہ نہیں کیوں انہیں اپنے شریکِ جرم پر بھی اتنا ہی اعتماد ہوتا ہے جتنا خود پر ممکن ہے"!

"شریک جرم ؟ میں نہیں سمجھا" میں بولا۔

"مقتولہ کو مظلوم نہ سمجھو! وہ اس جرم میں برابر کی شریک تھی۔ وہ صرف اس لئے مار ڈالی گئی کہ اس نے بوکھلاہٹ میں طارق سعید کا صحیح نام تمہیں بتا دیا تھا! . . . جب تم اسے گرینڈ ہوٹل میں چھوڑ کر واپس گئے تو وہ وہاں پہنچا تھا اور سلطانہ نے اس سے تذکرہ کیا تھا کہ وہ غلطی سے اس کا نام لے بیٹھی ہے۔ بس چچا سعید نے فوری اشتعال کے تحت اس کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ ان کی داشتہ تھی"

"لیکن چکر کیا تھا ؟"

"بس اتنی سی بات تھی کہ چچا سعید مجھے قتل کر دینا چاہتے تھے"

"آخر کیوں ؟ آپ کو قتل کرانا چاہتے تھے، حیرت ہے"

"سنتے جاؤ، شاید تمہارے حواس بھی درست نہیں . . . انکل سعید وہ قریب ترین عزیز ہیں، جنہیں میرا ترکہ مل سکتا ہے"!

میرا سر چکرا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ اس تصویر اور اسکینڈل کی کیا ضرورت
تھی اور پھر وہ تو صرف مجھے بدنام کرتی پھر رہی تھی، بھلا اس سے کرنل کا
کیا تعلق ؟ اس سوال کا جواب بہت زیادہ حیرت انگیز تھا۔ اس سے بھی
زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کرنل نے مجھے اس وقت قتل کیوں نہ کر دیا
تھا، جب میں نے انہیں یہ تصویر دکھائی تھی۔ ہو سکتا ہے میرا یہی حشر
ہوتا۔ اگر وہ کسی اقدام سے قبل پوری طرح اطمینان نہ کر لینا چاہتے۔
میں نے ان کے سامنے ایک البم پڑا ہوا دیکھا تھا اور میری دی ہوئی
تصویر ان کے سامنے تھی۔ البم کی جس تصویر سے وہ اس تصویر کو ملانا
چاہتے تھے۔ اگر البم میں نہ ملی ہوتی تو میرا پتہ نہیں کیا حشر ہوتا۔ وہ ان
کے والد صاحب کی جوانی کی ایک تصویر تھی . . . ! میں نے سُنا اور
وہ سناٹے میں آگیا۔

"ظاہر ہے !" کرنل بولے ! "جب وہ تصویر مجھ تک پہنچی تو میں آپے
سے باہر ہو کر اس عورت کی تلاش شروع کر دیتا کہ وہ تصویر اسے کس
سے ملی ہو گی اور وہیں موقع دیکھ کر انکل سعید مجھے ٹھکانے لگا دیتے۔"

"لیکن مجھ تک تصویر پہنچانے کے بعد بھی وہ لوگ یہاں کیوں ٹھہرے
رہے . . . ؟" میں نے پوچھا۔

"یادداشت پر زور دو، پہلی بار تم اس سے میک اَپ میں ملے تھے،
. . . اور تم نے خود کو کیپٹن حمید ظاہر کیا تھا۔ انکل سعید اس وقت بھی
وہیں موجود تھے۔ وہ تمہیں پہچانتے تھے، میرے سارے ہی اعزا تمہیں

پہچانتے ہیں۔ خواہ تم انہیں نہ جانتے ہو۔ کم از کم سبھوں نے تمہاری تصویریں تو دیکھی ہی ہیں۔ بہرحال انکل سعید تمہارے میک اپ میں ہونے کی وجہ سے تمہیں نہ پہچان سکے اور سلطانہ کو بتایا کہ تصویر غلط ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اس کے قیام کا انتظام گرینڈ میں کر دیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ تمہیں بدنام کرنے کا سلسلہ جاری رکھے اور وہ خود یہ دیکھیں گے کہ تصویر کون لے گیا ہے! دوسرے دن تم اسے اپنی اصلی شکل میں ملے اور وہ نروس ہو گئی اور ہوٹل ڈی فرانس سے اپنی منتقلی کے بارے میں ایک کہانی فوری طور پر گھڑ ڈالنے کی کوشش تو کی لیکن نروس ہو جانے کی وجہ سے اس میں کامیاب نہ ہو سکی اور بے خیالی میں سعید کا نام زبان سے پھسل گیا۔ بہرحال ہم نے انکل سعید کو اس وقت جا لیا تھا، جب وہ اس کے قتل کے بعد ہوٹل ڈی فرانس سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، تصویروں کے اس بیوپاری نے بھی انہیں شناخت کر لیا ہے، جس سے انہوں نے اسی پوز کا پورا اسٹاک حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔" کرنل خاموش ہو کر سگار کے کش لینے لگے۔

"اب طارق سعید کے بارے میں مزید کچھ بتائیے؟" میں نے کہا۔

"کیا بتاؤں؟" کرنل نے طویل سانس لی۔ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے "بے اعتدالی آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کی بھی خاصی بڑی جائداد تھی لیکن عیاشیوں کی نذر ہو گئی۔ اتفاق سے ان

کے بھی آگے پیچھے کوئی نہیں ہے . . . کسی دن شراب کے نشے میں بیٹھ کر دولت حاصل کرنے کی اس جدوجہد کی اسکیم بنا ڈالی ہوگی۔ یعنی میری موت کے بعد اسی طرح یہ سب کچھ اُن کے ہاتھ میں آتا جیسے الہ دین کا چراغ شاملِ حال ہو۔"

کھیل ختم ہو چکا تھا، مجھے وہ عورت یاد آئی۔ اس کی غمگین آنکھیں یاد آئیں۔ اُن کی بناوٹ نے عجیب سا سوز و گداز اس کی شخصیت کو عطا کیا تھا کون باور کرتا کہ وہ قتل کی سازش میں ملوث ہوگی۔

. . . .

ہوائی قلعہ

یُوں بھی اگر ٹرین تین گھنٹے لیٹ ہو تو ویٹنگ روم میں لیٹ کر ہوائی قلعے بنانا صحت کے لئے بے حد مفید سمجھا جاتا ہے. پھر مجھ سا بااصول آدمی تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب فرصت میسّر ہو اور کب اپنے دشمنوں سے انتقام لینا شروع کر دے۔ لال قلعے پر دھاوا بولا جاسکتا ہے . . . لیکن ہوائی قلعے پر دشمنوں کے فرشتوں کی بھی نظر نہیں پڑ سکتی۔ لہٰذا دشمنوں سے نپٹنے کے لئے ہوائی قلعے سے زیادہ محفوظ اور کوئی مورچہ نہیں ہو سکتا۔ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے جاسکتے ہیں. مثال کے طور پر اسے یوں سمجھیئے کہ آپ اپنے حریف کے ہاتھوں پٹ جانے کو انسانیت تصور کرتے ہیں اور دُم دبا کر بھاگنے کو انسانیت کی معراج . . . لیکن رات کو سونے سے قبل آپ کو اپنے حریف پر بہت شدت سے غصّہ آتا ہے اور آپ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر اُسے اس قدر پیٹتے ہیں کہ وہ بے دم ہو کر "رحم، رحم" چلّانے لگتا ہے اور آپ اس کی پروا کئے بغیر کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ اگر اس وقت

ہوائی قلعہ آپ کو پناہ نہ دے تو آپ رات بھر جھلا جھلا کر رزمیہ شاعری ہی کرتے رہ جائیں۔

بہر حال، ہوائی قلعہ بہت عمدہ چیز ہے۔ میں پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ تھوڑا بہت وقت ہوائی قلعے میں ضرور گزارا کیجیے۔ ہاں تو میں آپ کو اپنے ہوائی قلعے سے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ میرا کوئی دشمن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا میرے ہوائی قلعے کو تو بالکل ویران ہونا چاہیئے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خانہ خالی را زن می گیرد۔ ابتداً میں دشمن والی بات تو میں نے یونہی کہہ دی تھی۔ میرے اپنے ہوائی قلعے میں دشمن کا نام و نشان تک نہیں۔ میں تو ڈیننگ رُوم کی ایک کرسی پر نیم دراز کچھ اِس انداز سے اپنے ہوائی قلعے کی بنیاد رکھ رہا تھا کہ ٹرین میں تِل رکھنے کی بھی جگہ نہ ہوگی۔ صرف ایک چھوٹا سا سکینڈ کلاس کمپارٹمنٹ خالی ہوگا۔ اس میں ایک ملائک فریب دوشیزہ بیٹھی رسالہ "مایا مچھندر" کا وہی شمارہ دیکھ رہی ہوگی جس میں میری تصویر چھپی ہے۔ میں فلسفیوں کی سی شان کے ساتھ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوں گا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھے گی اور میں بڑی بے پروائی سے برتھ پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگاؤں گا۔ . . پھر بے خیالی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا اور جلی ہوئی دیا سلائی ہونٹوں میں دبا کر کسی موٹی سی کتاب پر نظریں جما دوں گا۔ . . پھر کتاب بند کر کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹرین کے باہر پھیلی ہوئی تاریکی میں گھورنے

لگوں گا۔ اِس دوران میں وہ بے چینی سے پہلو بدل بدل کر کھکھارتی رہے گی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا ہو گا کہ مجھے کس طرح اپنی طرف متوجہ کرے۔ تھوڑی دیر بعد ڈرتے ڈرتے کہے گی "کیا میں آپ کی یہ کتاب دیکھ سکتی ہوں؟"

پہلے تو میں اسے قہرآلود نظروں سے گھوروں گا۔ پھر ڈانٹ کر کہوں گا "ضرور دیکھیے۔ ۔ ۔ لیکن احتیاط سے" وہ کتاب اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دے گی اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی کن انکھیوں سے دیکھتی جائے گی۔ مَیں خیالات میں ڈوب کر اپنے بال مٹھیوں میں جکڑنے لگوں گا۔ کچھ دیر بعد وہ کہے گی "گستاخی ضرور ہے۔ ۔ ۔ لیکن کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"مجھے چرخل شیطان کہتے ہیں" مَیں کراہت سے ہونٹ سکوڑ کر کہوں گا۔

"اُف وہ! آپ ہی چرخل شیطان ہیں" وہ پُرمسرت لہجے میں چیخے گی "آپ ہی کی تصویر "مایا مچھندر" میں چھپی ہے؟ آپ کے افسانوں میں بڑا سوز گداز ہے" ایک ہی سانس میں پتہ نہیں کیا کیا کہے جائے گی اور میں بدستور نفرت سے ہونٹ سکوڑے رہوں گا "مجھے حسن آرا کہتے ہیں۔ مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے۔ آپ کے افسانوں کی عاشق ہوں اور ہر اس رسالے کی خریدار ہوں جس میں آپ لکھتے ہیں۔ اوہ، میں اس وقت کتنی خوش ہوں"

"لیکن مجھے بالکل خوشی نہیں ہوتی!" میں کہوں گا۔

"اوہ . . . کتنے ظالم ہیں آپ! میں آپ کی تصویر دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو گئی تھی" وہ سسکیاں لیتی ہوئی کہے گی۔

"مگر مجھے ایک جان سے بھی آپ کی پرواہ نہیں!" میں مسکرا کر کہوں گا۔

"دیکھئے یہ نہ کہئے! ورنہ میں ابھی چھلانگ لگا دوں گی۔" وہ سچ مچ چھلانگ لگا دینے پر تیار ہو جاتے گی اور میں جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے اپنی کتاب چھین لوں گا۔ "ہائے ظالم" کہہ کر اس قدر روئے گی کہ ہچکیاں لگ جائیں گی . . . پھر میں کوشش کروں گا کہ مجھے اس پر رحم آجائے لہٰذا میں کہوں گا۔ "خیر اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو میں ہر قسم کی قومی خدمت کے لئے تیار ہوں۔" وہ خوش ہو جائے گی اور پھر ہم ایک ڈوئیٹ گائیں گے۔

ہوائی قلعہ ابھی زیرِ تعمیر ہی تھا کہ ٹرین آگئی۔ قُلی جھپٹ کر اندر آیا اور میرا اسامان اٹھا کر ٹرین کی طرف لپکا۔ ہوائی قلعے کے مطابق واقعی ٹرین میں کہیں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ رات کا وقت تھا اس لئے لوگ تل رکھنے کی جگہ بھی پیر پھیلاتے سو رہے تھے۔ اتفاق سے سیکنڈ کلاس کا ایک چھوٹا سا کمپارٹمنٹ خالی نظر آیا۔ لیکن قریب پہنچنے پر مایوسی ہوئی کیونکہ پورا کمپارٹمنٹ مخصوص تھا۔ دراصل جس ٹرین کے لئے میں نے ریزرویشن کرایا تھا، وہ پہلے ہی چھوٹ گئی تھی۔ میں دیر سے

اسٹیشن پہنچا تھا۔ خیال تھا کہ دُوسری ٹرین کے لئے ریزرویشن کرالوُں گا۔ لیکن کھڑکی پر جواب مِلا کہ جگہ ملے تو بیٹھ جائیے گا۔ اس گاڑی پر ریزرویشن نہیں ہوسکے گا۔ مَیں اس کمپارٹمنٹ کے سامنے سے ہٹنے ہی والا تھا کہ کہ اندر سے آواز آئی تشریف لائیے !"

ایک نہایت متین اور باوقار نوجوان سامنے کی برتھ پر کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ میں نے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوتے چند ٹوٹے پھوٹے جُملے بطور اظہارِ تشکر عرض کئے۔ کمپارٹمنٹ میں دو ہی افراد تھے۔ ایک وہ خوُد اور دوُسرے صاحب لحاف میں سرتاپا لپیٹے ہوئے خرّاٹے لے رہے تھے۔ خرّاٹوں کی مردانگی سے مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ کاش ہوائی قلعے کے مطابق مجھے ڈوئیٹ گانے کا موقع مل سکتا۔ ایک کمپارٹمنٹ میں مرد ہی مرد۔ لاحول ولاقوۃ اور کتنا پھیکا رہے گا یہ سفر بھی۔ . . میں سوچ کر نڈھال ہو جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ نوجوان بولا "بے تکلفی معاف، کیا آپ مجھے سگریٹ پلائیں گے ؟"

"حاضر ہے ! " میں نے ڈبّہ بڑھا دیا۔

"شکریہ !" کہہ کر اُس نے سگریٹ سُلگایا اور دو تین کش لینے کے بعد سر ہلا کر فلسفیانہ انداز میں بولا "کتنا سکوُن ملتا ہے سگریٹ سے، لیکن حرکت کا نام زندگی ہے تو سکون موت . . . ! لہٰذا اگر سگریٹ کو ملک الموت کہا جائے تو کیا حرج ہے ؟"

میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا کہ یہ ظالم بھی ہوائی قلعے بنانے کا اسپیشلسٹ معلوم ہوتا ہے لیکن منطق ذرا غلط ہے . . .

"ہنسیے نہیں!" وہ سنجیدگی سے بولا "افلاطون کہتا ہے کہ ہنسنے سے آنسو بنتے ہیں۔"

میں پھر ہنس پڑا۔

وہ سر ہلا کر بولا "آپ بہت موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا کوئی اچھی سی نظم سنا دیجیے!"

اب میں گھبرا گیا۔ مجھ میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ گھبراہٹ میں بری طرح ہکلانے لگتا ہوں۔ لہٰذا نہایت آسانی سے ہکلانے لگا۔ "مم . . . میں . . . واللہ . . . شش . . . شاعر . . . نن نہیں ہوں!"

"تو پھر آپ یہاں آئے کیوں؟ میں نے شاعر ہی سمجھ کر آپ کو قابلِ رحم سمجھا تھا۔ براہِ کرم آپ اگلے اسٹیشن پر اتر جائیے گا۔"

میں گڑگڑانے لگا لیکن اس نے ایک نہ سنی! مجبوراً ذہن پر زور دینا پڑا۔ یکایک ایک صاحب کی نظم "سکوت" یاد آ گئی اور میں انہیں کی طرز میں رو رو کر گانے لگا۔

"اس نظم کا عنوان سکوت کیوں ہے اِس میں تو سکوت بالکل نہیں پایا جاتا۔" وہ ڈپٹ کر بولا۔

"کوئی اور عنوان سمجھ میں نہیں آیا تھا۔"

"اب اِسے سکوت کی بجائے غل غپاڑہ، کر دو!"

"جی۔ بہت اچھا" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ٹھیک . . . اچھا یہ بتاؤ کبھی تم نے محبت بھی کی ہے یا نہیں؟ ذرا ایک سگریٹ اور"

اس کی یہ بے تکلفی انتہائی تکلیف دہ محسوس ہوتی تھی۔ بُرے پھنسے، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کا ہوائی قلعہ بہت مستحکم معلوم ہوتا ہے خدا ہی لاج رکھے۔ بہر حال میں نے جی کڑا کر کے کہا "محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے"

"نہایت فرسودہ نظریہ ہے!" وہ بیزاری سے بولا "والد صاحب بھی یہی کہتے ہیں، لیکن میں اسے تسلیم نہیں کرتا"

"لیکن مجھے آپ کے والد صاحب سے اتفاق ہے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"والد صاحب" وہ حقارت سے بولا۔ "اگر والد صاحب شہتوت نہ کھاتے تو واقعی بڑے آدمی ہوتے۔ پور اُولڈ ہارٹ"

"اچھا تو آپ کے والد صاحب شہتوت بھی کھاتے ہیں" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"للّٰہ اِسے نہ دہراؤ۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے" وہ بیزاری سے بولا "ہاں تو مَیں محبت کے متعلق کہہ رہا تھا۔ . . تو تم نے کبھی محبت نہیں کی۔ بُہت ڈرپوک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مجھے دیکھو میں نے کئی بار

محبت کی ہے۔ تم نے کبھی بھینس کو جگالی کرتے دیکھا ہے ؟"

میں نے گڑبڑا کر پان تھوک دیا۔

"زیادہ نہیں تھوڑے سے احمق ضرور ہو۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ پان تھوک دو۔ مجھے جگالی کرتی ہوئی بھینسیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ غالباً تمہیں بھی پسند ہوں گی ؟"

میں نے گھبرا کر پوچھا "آپ کسی کالج میں لیکچرار تو نہیں ہیں ؟"

"بکواس مت کرو۔ مجھے لیکچرر اچھی نہیں لگتی۔ میں مسافروں سے اُن کے نام بھی نہیں پوچھتا۔ ممکن ہے، تمہارا نام اِس قسم کا ہو کہ مجھے سُن کر مغموم ہونا پڑے۔ . . ."

میں سوچ رہا تھا کاش اس کمپارٹمنٹ میں بھی تل رکھنے کی بھی جگہ نہ ہوتی۔

"کیا سوچنے لگے" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "ضرور تم نے محبت کی ہے۔ تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے، تمہاری ناک کی بناوٹ بتاتی ہے کہ تم نے کوئی گہری چوٹ کھائی ہے۔ تمہارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ کوئی دکھ بھرا گیت گانا چاہتی ہے۔ مجھے سناؤ میں تمہاری داستانِ غم سنوں گا۔ . . سُناؤ نا"

اب مجھ پر بوکھلاہٹ کا دورہ پڑا۔ لاکھ ذہن پر زور ڈالا لیکن کوئی ایسا مستحکم ہوائی قلعہ نہ مل سکا جس میں بیٹھ کر اس کا مقابلہ کر سکتا۔ ناچار میں نے بے بسی سے دانت نکال کر شکست تسلیم کر لی۔

"سناؤ نا!" وہ دوبارہ ڈپٹ کر بولا۔
"میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے کبھی اس کا اتفاق نہیں ہوا۔"
میں نے رو دینے کا تہیہ کر کے کہا۔
آدمی کچھ سمجھدار تھا، مسکرا کر بولا "نہیں سناتے تو نہ سناؤ، لیکن میں تمہیں اپنی داستانِ محبت ضرور سناؤں گا۔ ۔ ۔ یہ وہ آگ ہے جس نے میرے وجود کو خاکستر کر دیا ہے۔ میں جلا جا رہا ہوں۔ ۔ ۔ تھکا جا رہا ہوں ۔ ۔ ۔ کیا یہاں تھوڑا ٹھنڈا پانی مل سکے گا۔ ۔ ۔ نہیں، خیر جانے دو۔ ۔ ۔ ایک سگریٹ ۔ ۔ ۔ ہاں تو اس کا نام منشی رحمت النسآ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ہنسو نہیں، واللہ اس نے منشی کے امتحان میں بہت اچھے نمبر حاصل کئے تھے۔ وہ بہاروں کا گایا ہوا ایک غیر فانی گیت تھی۔ وہ گیت جس نے اُفق کے دُھندلکوں سے بلند ہو کر دُنیا کے ہر عرض البلد اور طول البلد کا سفر کیا تھا۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ خطِ استوا سے بحرِ منجمد شمالی تک اسی کا راج تھا۔ یقین نہ آتے تو کیپٹن اسکاٹ کی ڈائری دیکھو۔ کیپٹن اسکاٹ اپنی منزلِ مقصود تک بڑی مشکل سے پہنچا تھا، لیکن ہیہات ایک آدمی اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس کے ملک کا پرچم لہراتے دیکھ کر اسکاٹ کا دل ٹوٹ گیا۔ ہائے اور وہ پھر کبھی واپس نہ آسکا۔ اس کی لاش وہیں کہیں برف کے کسی تودے میں دبی پڑی ہو گی۔ برف میں لاشیں محفوظ رہتی ہیں۔ میرے دادا کے چھوٹے بھائی پہلی جنگ عظیم میں لڑتے ہوتے مارے گئے تھے۔ میرے دادا بھی اسی

مورچے پر لڑ رہے تھے۔ انہوں نے تین مہینے تک لاش برف میں دبا رکھی تھی اور اسے اپنے ساتھ واپس لاتے تھے اور دادا مرحوم کے چھوٹے بھائی !" وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو گیا اور دیر تک تاریکی میں ڈوبے ہوئے میدانوں میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ پتہ نہیں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

" اور وہ رحمت النساء ؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

" چھوڑو بھی . . . دوسری داستان سنو۔ میں نے کئی بار محبت کی ہے! سنو ! اُس کا نام چاندنی تھا۔ . . آہ وہ کتنی حسین تھی، جب وہ چلتی تو ایسا لگتا جیسے دیولوک کی کوئی رقاصہ ناچتے وقت ہولے ہولے ٹھوکریں دے رہی ہو۔ جب وہ چٹکی میں اپنی ستواں ناک دبا کر چھینکتی تو فضاؤں میں ایک رسیلے گیت کی مدھم جھنکاری گونج کر رہ جاتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میں نے سنگیت کی سروں کو چھو لیا ہو۔ اس راگنی کی دیوی کے انگ انگ سے جوانی کے مدھر گیت پھوٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، جس دن والد صاحب نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو میرے جسم سے پسینے کی دھار بہہ نکلی۔ اسی دن سے وہ کہنے لگے تھے کہ محبت کی نہیں جاتی، بلکہ ہو جاتی ہے، اگر تم میرے والد صاحب سے ملو تو تمہیں بے حد مایوسی ہو۔ . . غالباً . . . منن . . . منن . . . روں . روں . . . گھوں . . . بھن بھن . . . بھن . . . " وہ بولتا رہا لیکن مجھے اس کی آواز ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے دور . . . بہت دور . . . اُفق میں کوئی مچھر بھنبھنا رہا ہو۔" اچھا تو . . . تم سو رہے ہو !" وہ میرا

شانہ پکڑ کر دھاڑا۔

"نہیں تو۔ ۔ ۔" میں نے چونک کر خواہ مخواہ مسکرانے کی کوشش کی۔

"اچھا تو بتاؤ۔ ۔ ۔ میں ابھی کیا کہہ رہا تھا!"

"آپ۔ ۔ بک۔ ۔ ۔ کیا۔ ۔ ۔ کہہ۔ ۔ ۔" میں پھر ہکلانے لگا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں اُٹھا کر باہر پھینک دُوں تو کیسی رہے؟"

"ارے۔ ۔ ۔ ہی ہی ہی ہی!" میں نے اخلاقاً دانت نکال دیئے۔

"اُف وہ۔ ۔ ۔ بالکل وہی انداز ہے۔ ایک بار پھر اسی طرح ہنسو! لِلّٰہ پھر ہنسو! ہائے بالکل اسی طرح وہ بھی ہنستی تھی۔ ۔ ۔ اُف چاندنی ۔ ۔ ۔ ہائے چاندنی، کتنی حسین تھی وہ۔ کہکشاں کی بیٹی! ۔ ۔ ۔ ہائے وہ بربطِ ناہید کی ایک نہ ٹوٹنے والی نے تھی۔ جب پہلے پہل اس سے میری نگاہیں آٹھ ہوئیں! ۔ ۔ ۔ ہنسو نہیں۔ آٹھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ عینک بھی لگاتی تھی۔ اس عینک کے شیشے اِتنے دبیز تھے کہ اُس کی آنکھیں مجھے صاف نہیں نظر آتی تھیں۔ اس لئے میں بھی عینک لگانے لگا تھا۔ ۔ ۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"جب پہلے پہل نگاہیں چار ہوئیں!" میں نے۔ ۔ ۔ بے دلی سے یاد دلایا۔

"تمہیں ضد ہو گئی ہے!" وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "میں کہتا ہوں

نگاہیں آٹھ ہوئیں اور تم وہی چار چار بکے جا رہے ہو!"
مجھے کچھ کچھ غصہ آچلا تھا۔ لہٰذا میں نے جھلّا کر کہا "نگاہیں ہر حال میں چار ہوں گی چاہے آپ عینک لگائیں چاہے وہ عینک لگائے... عینکوں سے نگاہوں کی تعداد نہیں بڑھ سکتی"

"بڑھ کیوں نہیں سکتی؟"

"ہرگز نہیں بڑھ سکتی!"

"میں بڑھا سکتا ہوں"

"آپ کو کوئی حق حاصل نہیں" میرا غصہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔

"نگاہیں آٹھ ہوئیں... نگاہیں آٹھ ہوئیں... نگاہیں ناٹھ" غالباً اُسے بھی جوش آگیا تھا۔

"آپ محاورے کا خون کر رہے ہیں!" میں پوری طاقت سے چیخا۔

"محاورے کی ایسی تیسی... میں تمہارا خون کر دوں گا" وہ میری طرف جھپٹا اور میں نے بدحواسی میں چھلانگ لگائی تو سوتے ہوئے آدمی پر جا پڑا۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا "کون ہو تم... " وہ خوفزدہ آواز میں چیخا۔

"مم... مم... مسافر...!" میں ہکلایا۔

"لیکن یہاں کیوں آئے ہو... یہ کمپارٹمنٹ ریزرو ہے"

"انہوں نے بُلا لیا تھا" میں نے سہم کر اس خونخوار کی طرف اشارہ کیا۔
"وہ تو پاگل ہے!"
"ارے!" بیساختہ میرے منہ سے نکلا۔ اب جو میں نے غور سے دیکھا تو اس کے پیر میں زنجیر نظر آئی، جس کا دوسرا سرا برتھ کے پائے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ اب بھی کھڑا چیخ رہا تھا۔
"نگاہیں آٹھ ہوئیں . . . نگاہیں آٹھ ہوئیں . . . نگاہیں آٹھ . . . ہات تیری محاورے کی ایسی تیسی . . . ہات تیری . . . !"

. . . . . .

ایک رومانی افسانہ

پھر وہ مجھے پسند آگئی . . .

اور میں اسے دہلی سے اڑا لایا۔ راستے بھر یہ خوف لگا رہا کہ کہیں
اگلے اسٹیشن پر پولیس میرے استقبال کا خاطر خواہ انتظام نہ کر رہی ہو ۔
لیکن یقین جانیے کہ ان معاملات میں کافی خوش نصیب واقع ہوا ہوں...
گھر پہنچ کر مجھے ایک بہت بڑے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا . . . .
میرے گھر کی مذہبی فضا میں بھلا اس کا وجود کیونکر برداشت کیا جا سکتا
تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے حالات پر قابو پا ہی لیا . . . . .
اب وہ مجھ سے کافی محبت کرنے لگی تھی . . . شروع شروع میں تو
اس نے کئی بار اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے سلسلے میں میری اچھی خاصی
مرمت کر دی تھی . . . لیکن رفتہ رفتہ اس کے رویے میں تبدیلی
ہوتی گئی اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی ۔
. . . لیکن ذرا ٹھہریے . . . ساتھ ہی ساتھ میں آپ کی وہ غلط فہمی
بھی دور کرتا چلوں جس میں آپ کہانی شروع کرتے ہی مبتلا ہو گئے ہیں

جی ہاں ۔ ۔ ۔ یہ کسی عورت کی کہانی نہیں ۔ ۔ ۔ میں رومانی افسانوں میں عورت کے تذکرے کا سرے ہی سے قائل نہیں ۔ ۔ ۔ اور پھر آپ یہ بتایئے کہ ہماری سوسائٹی میں عورت ہوتی ہی کہاں ہے ۔ ۔ ۔ میں نے تو آج تک نہیں دیکھی ۔ ۔ ۔ ممکن ہے آپ کو ملنے کا اتفاق ہوا ہو۔ یہ آپ کی اپنی شامت ہے۔ مجھے اس سے کیا سروکار ۔ بات چل نکلی ہے تو اتنا اور سُن لیجیے کہ میں بھی رومانی افسانے پڑھ پڑھ کر کافی عرصے تک تباہ حال رہ چکا ہوں ۔ ۔ ۔ اور سچ پوچھیے تو میری افسانہ نگاری کی سب سے بڑی وجہ یہی رومانی افسانے ہیں ۔ ۔ ۔ میں ان افسانوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا کرتا تھا کہ ہر افسانہ نویس پر کسی نہ کسی عورت کا عاشق ہو جانا اتنا ہی یقینی ہے جتنا کہ خود افسانہ نویس کا تپ دق میں مبتلا ہو جانا ۔ اس قسم کے سارے افسانوں میں قریب قریب ایک ہی سے پلاٹ ہوا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ مثلاً افسانہ نگار دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے بند کمرے میں بیٹھا افسانہ لکھ رہا ہے اور سگریٹ کھا رہا ہے ۔ ۔ ۔ اچانک کمرے کی چھت برحمت پروردگار شق ہوتی ہے اور ایک عورت ٹپک پڑتی ہے ۔ ۔ ۔ اور پھر ۔ ۔ ۔ اور پھر ۔ ۔ ۔ یا تو دونوں سماج سے انتقام لینے کے لئے خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر شادی کر کے باقاعدہ بچے پیدا کرنے لگتے ہیں ۔

ان افسانوں کو پڑھ کر میں نے بھی افسانہ نویس بننے کا تہیہ کر لیا ۔ ۔ ۔ لیکن میں آپ سے اس گدھے کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جس نے دنیا کا

سب سے پہلا رومانی افسانہ لکھا تھا کہ مجھے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ۔ ۔ مجھے کسی عورت نے لفٹ نہیں دی۔ ۔ ۔ لیکن میں آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ۔ ۔ میں نے اپنے گلے میں تختی لٹکالی جس پر لکھا ہوا تھا "طغرل فرغان۔ ۔ ۔ ایشیا کا مایہ ناز افسانہ نگار"۔ ۔ ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والوں نے دھمکانا شروع کر دیا۔ ۔ ۔ اور محلے کے بچے مجھ سے خوف کھانے لگے۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر میں عورت کے وجود ہی کا منکر ہو گیا۔ ۔ ۔ میں اب بھی رومانی افسانے لکھتا ہوں، لیکن ان میں عورت کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ !

ہاں تو وہ عورت نہیں بلکہ ایک بہت ہی نفیس قسم کی ایلیشین کتیا تھی! وہ دہلی میں ایک ملٹری آفیسر کے یہاں پلی ہوئی تھی۔ ۔ ۔ میں اسے اڑا لایا۔ ۔ ۔ میں نے اس کے دل کا درد پا لیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے! آپ مجھے احمق سمجھ رہے ہوں گے۔ ۔ ۔ بھلا کتیا کے دل کا حال ایک انسان کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ ۔ ۔ لہٰذا سنیئے کہ میں نے ایک مادر زاد لیڈر سے جانوروں کی زبان سیکھی ہے آپ کہیں گے کہ یہ معجزہ تو صرف حضرت سلیمان کے پاس تھا۔ ۔ ۔ لیکن آپ غلطی پر ہیں۔ آج کے بہتیرے لیڈر جانوروں کی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جانوروں کی فریاد پر آدمیوں کو قتل کرا دیتے ہیں۔ جانوروں کو آدمیوں سے اونچا درجہ دیتے ہیں۔ آپ خود سوچئے کہ یہ سب اسی وقت ممکن ہے، جب جانوروں کی زبان سمجھ میں آتی ہوا

ہاں تو بہرحال میں جانوروں کی زبان جاننے کی بنا پر اس کُتیا کے دُکھ درد سے واقف ہو گیا۔ ۔ ۔ اور اُسے اُٹھا لایا۔ ۔ ۔ کافی عرصہ تک زنجیر سے باندھ کر اظہار محبت کرتا رہا۔ ۔ ۔ لیکن بے سود وہ کسی طرح راہِ راست پر آتی ہی نہ تھی۔ ۔ ۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ جب تک سیدھی نہ ہو جاتے گی آزاد نہ کروں گا۔

اچانک ایک دن وہ کہنے لگی "کیا واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

"اس وقت کوئی تیز چھُری موجود نہیں ہے۔ ورنہ دل چیر کر دکھا دیتا!"

دل کے نام پر اس کے مُنہ سے رال ٹپکنے لگی۔ ۔ ۔

"اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو تو پھر بے اطمینانی کا کیا مطلب!"

"بات دراصل یہ ہے تم ایک السیشین کتیا ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ دیسی کُتے تمہارے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئیں!"

"کمال کرتے ہو ڈارلنگ!" وہ مُسکرا کر بولی۔ "بھلا مجھے اب کتوں سے کیا کام!"

"کیا مطلب!"

"دل سے پوچھو" اُس نے کہا اور شرما کر سر جھکا لیا۔ ۔ ۔

دوسرے ہی لمحے میں وہ بالکل آزاد تھی اور میں اُسے گود میں اٹھائے ڈرائنگ روم کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ۔ ۔ میں نے اس کے لئے کچھ

مٹن چاپ منگوائے اور کھلانے لگا۔ ۔ ۔ باہر سڑک پر کُتے بھونک رہے تھے ۔ ۔ ۔

"ڈارلنگ ایک بات کہوں بُرا تو نہ مانو گے" اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

"ہرگز نہیں"

مجھے چند منٹ کے لئے سڑک پر جانے دو"

"پھر وہی" میں نے بُرا مان کر کہا "جب ایک انسان تم سے محبّت کرنے لگا ہے تو تمہیں کتّوں کی سوسائٹی سے دور رہنا چاہیئے!"

"اوہ ڈارلنگ وہاٹ اے فول یو آر" وہ مسکرا کر بولی "میں تو صرف تھوڑا سا بھونکنا چاہتی تھی"

"یہ بات ہے" میں چہک کر بولا "تو آؤ میں تمہارا ساتھ دوں گا!"

وہ بھونکنے لگی اور میں نے بصد سوز و گداز گانا شروع کر دیا!"

"گائے جا گیت ملن کے تو اپنی لگن کے سجن گھر جانا ہے"

جب ہم کافی دیر تک بھونک چکے تو وہ میری گردن میں اپنی ٹانگیں حمائل کرتی ہوئی بولی "واقعی ڈارلنگ تم بہت ہی آرٹسٹک انداز میں بھونک لیتے ہو"

"جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد" میں نے بطرزِ قوالی ہانک لگائی

اور وہ بھونکنے لگی۔ ۔ ۔

ڈرائنگ روم میں ہڈسن کر گھر کے تین افراد وہاں آگئے اور ہمیں خاموش ہو جانا پڑا۔ ۔ ۔ جب سے کتیا آئی تھی۔ گھر والوں کا کچھ عجیب حال ہوگیا تھا۔ مجھے کتیا کے ساتھ کسی وقت بھی تنہا نہ چھوڑتے۔ ۔ ۔ ان کے تیور بھی کچھ عجیب سے ہو گئے تھے! بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ سب اچھل کر مجھے دبوچ لیں گے۔

میں ان کی اس حرکت پر دل ہی دل میں تاؤ کھاتا اور بلند آواز سے گاتا تھا۔

دو دلوں کو یہ دنیا ملنے نہیں دیتی
آشاؤں کی کلیوں کو کھلنے ہی نہیں دیتی

اس وقت بھی اُن سب نے شاید یہ طے کر لیا تھا کہ ڈرائنگ روم ہی میں جمے رہیں گے۔ میں نے بھی کہا جہنم میں جاؤ اور کُتیا سے بغلگیر ہو کر اونگھنے لگا۔

ان میں سے ایک صاحب کسی رسالے کا ایک رومانی افسانہ بلند آواز سے پڑھ رہے تھے جس میں بار بار" ظالم سماج "کا ذکر آرہا تھا۔

"یہ سماج کیا چیز ہوتی ہے" کتیا نے آہستہ سے پوچھا۔

"میں نے بھی سماج کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے" میں نے اس کے ملائم بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "لیکن اصحاب کہف کے کتے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ

سماج کس چڑیا کا نام ہے؟"
"سماج گیا چولھے میں . . . . تم میرے بزرگوں کا نام اتنی بدتمیزی سے کیوں لیتے ہو؟" وہ تنک کر بولی۔
"ساری ڈارلنگ" میں نے اپنا منہ پیٹتے ہوئے کہا" اصحاب کہف کے جناب کُتے صاحب . . . اب خوش!"
اس نے واقعی ہی خوش ہوکر میرا منہ چوم لیا . . . اور میں نے . . . دوسرے ہی لمحے بڑے بھائی صاحب نے اچھل کر میری گردن دبوچ لی۔
"زنجیر لاؤ!" وہ چیخ کر بولے . . .
کُتیا گھبرا کر باہر بھاگ گئی۔
"خیریت . . . خیریت . . ." میں نے ہنس کر کہا۔
"اب ہم تمہیں پاگل خانے بھجوائے بغیر نہیں مان سکتے" بڑے بھائی صاحب نے کہا۔
"آپ ہوش میں ہیں یا نہیں؟" میں گرج کر بولا۔
قبل اس کے کہ بات زیادہ بڑھتی ایک بزرگ نے آکر بیچ بچاؤ کرادیا۔ گھر بھر میں یہی بزرگ ایک ایسے ہیں جنہیں میرے دکھ کا احساس ہے . . . اور کیوں نہ ہو . . . آخر وہ بھی صاحبِ دل ہیں۔ شاعر ہیں!
ایک دن کی بات ہے' میں بہت زیادہ اداس تھا۔ سورج دور

نیلی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سفیدے کے درخت چنار کے درختوں سے بغلگیر ہو کر رو رہے تھے! یا شاید ہنس رہے تھے۔ ۔ ۔ کچھ وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں درختوں کی زبان نہیں سمجھتا!۔

فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی پھیل رہی تھی۔ میرے دل میں ہوک اٹھی۔ ۔ ۔ پھر بیٹھی۔ ۔ ۔ اور پھر اچانک اٹھ کر دوڑنے لگی۔ ۔ ۔ میں سو فیصدی اداس تھا کیونکہ آج ہی گھر والوں نے زبردستی میرا سر منڈوا دیا تھا۔ ۔ ۔ خدا کی قسم یہ انتہائی غیر رومانی حرکت تھی۔ ۔ ۔ میں مغموم ہو ہو کر اپنے سپاٹ اور چکنے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ۔ ۔ دفعتاً ایک پپیہا دردناک آواز میں گانے لگا۔ ۔ ۔ میرا دل بھر آیا اور میں رو دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میری پیاری کُتیا اُچھلتی کُودتی ہوئی آگئی۔ ۔ ۔

"دیکھو تو ڈارلنگ یہ شام کتنی حسین ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ تمہاری شفاف کھوپڑی پر شفق کا رنگ کتنا سہانا لگ رہا ہے۔"

"سچ سچ" میں خوشی سے چیخا۔

"ہاں ڈارلنگ۔"

"تب تو میں روز صبح اپنے سر پہ اُسترا پھروا لیا کروں گا۔"

"ضرور!"

میری اداسی دور ہو گئی اور میں بڑے پیار سے اپنے سر پہ

ہاتھ پھیرنے لگا۔ لیکن میری یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی
کیونکہ پھاٹک کے باہر سڑک پہ ایک موٹا سا دیسی کتا بیٹھا میری کُتیا
کو بُری طرح گھور رہا تھا۔ ۔ ۔ مجھے غصّہ آ گیا۔ ۔ ۔
" وہ وہاں کیوں بیٹھا ہے " میں نے کُتیا کی طرف دیکھ کر کہا۔
" میں کیا جانوں بیٹھا ہو گا " کُتیا لاپروائی سے بولی " تمہیں آخر
پریشانی کس بات کی ہے "
" لیکن میں اسے وہاں نہیں بیٹھنے دوں گا " میں نے تیز لہجے میں کہا۔
" تم یہیں ٹھہرو میں اسے بھگا کر آتا ہوں "
" اُونہہ تم بھی عجیب آدمی ہو، جانے بھی دو "
میں نے مشکوک نظروں سے کُتیا کی طرف دیکھا۔
" اچھا جاؤ بھگا دو " وہ جلدی سے بولی " مردود اِدھر ہی تاکے
جاتا ہے "
میرا شبہہ رفع ہو گیا۔
" کیوں بے تو یہاں کیوں بیٹھا ہے " میں نے پھاٹک کے قریب
پہنچ کر اُسے ڈانٹا۔!
اُس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اپنی تھوتھنی سکوڑی اور ڈپٹ کر بولا۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

اس کی گھنی اور موٹی دم بل کھا کر اُس کے سر پہ لہرانے لگی ۔ ۔ ۔

اور میں شرمندہ ہو گیا۔ ۔ ۔ اگر میرے بھی دم ہوتی تو بتاتا بیٹا کو۔ میں ہمیشہ ایسے موقعوں پر احساس کمتری کا شکار ہو کر ارتقا کو گالیاں دینے لگتا ہوں۔ میں نے پلٹ کر کتیا کی طرف دیکھا۔ ۔ ۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ موقعہ بہت ہی نازک تھا۔

"بھائی صاحب اس وقت تو چلے ہی جایئے۔ ۔ ۔ ورنہ میری بڑی توہین ہو جائے گی" میں نے آہستہ سے گڑگڑا کر کہا۔

"خیر جاتا تو ہوں، لیکن تمہاری یہ ڈکٹیٹرانہ پالیسی مجھے قطعی پسند نہیں ۔ ۔ ۔ دوسرے موقعہ پر میں اسے بالکل نہ برداشت کر سکوں گا"

کتا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اور میں لوٹ آیا۔

"کیا کہہ رہا تھا" کتیا بولی۔

"کہتا کیا۔ ۔ ۔ وہ تو چلا ہی گیا ورنہ میں بتاتا سالے کو"

اب کتے نے مستقل طور پر تاک جھانک شروع کر دی تھی، مجھے کچھ محسوس ہو رہا تھا جیسے کتیا بھی اس کی طرف کچھ کچھ مائل ہے۔ ۔ ۔ یہ دیکھ دیکھ کر میرا کلیجہ خون ہو رہا تھا۔ ۔ ۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ کہاں انسان کہاں کتا۔ ۔ ۔ کیوں نہ میں اپنی خامیاں پوری کر دوں۔ ۔ ۔ شاید اسی طرح اس رقیب روسیاہ پر کچھ رعب پڑے۔ ۔ ۔ کبھی میں سوچتا کہ محبت کے لئے قربانی ضروری ہے۔ ۔ ۔ اگر واقعی کتیا اس کی طرف مائل ہے تو میں نہایت شرافت سے اسے اس ذلیل اور کمینے دیسی کتے کے حوالے کر کے خود جنگل کی راہ

لوں۔ دُنیا کے بڑے بڑے عاشقوں نے یہی کیا ہے ۔ ۔ ۔ انہوں نے اپنی محبوباؤں کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھ کر اپنے رقیبوں کا سالا بننا نہایت خوشی سے گوارا کر لیا۔

لیکن پھر میں یہ سوچتا کہ نہیں مجھے خواہ مخواہ شبہ ہو رہا ہے۔ میری پیاری کُتیا کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتی ۔ ۔ ۔ کہاں یہ السیشین کُتیا اور کہاں وہ اُلّو کا پٹھا دیسی کُتا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے شکست دینے کی ٹھان لی ۔ ۔ ۔ اس کے لئے میں پہلے ہی سے اسکیم بنا چکا تھا۔ ۔ ۔

میں نے اپنی ساری پتلونیں بکس سے نکالیں اور درزی کے یہاں پہنچ گیا۔

"فرمایئے حضور کیسے تکلیف کی" درزی نہایت خاکساری کے ساتھ بولا۔

"میں ان پتلونوں میں دُمیں لگوانا چاہتا ہوں"

"ہی ۔ ۔ ۔ ہی ۔ ۔ ۔ ہی ۔ ۔ ۔ دُمیں۔" وہ دانت نکال کر بولا "کیا تنگ ہو گئی ہیں"

"نہیں بھئی میں سچ مچ ان میں دُمیں لگوانا چاہتا ہوں"

درزی کو کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا۔ بہر حال بدقّت تمام اُسے سمجھا سکا کہ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔

دو دن کے بعد میرے بتلاتے ہوئے نقشے کے مطابق لگائی ہوئی دُموں سمیت پتلون مجھے واپس مل گئیں۔

میں نے ان میں سے ایک پتلون پہنی اور سارے گھر میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ . . لیکن میں اس کی پرواہ نہ کرکے کنیا کو ساتھ لے کر پائیں باغ میں چلا آیا!۔

"آج تو بہت جچ رہے ہو پیارے!" کنیا اٹھلا کر بولی۔

"واقعی" میں نے جھک کر کہا۔

"ہاں ڈارلنگ"

"اچھا سچ سچ بتانا تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے" میں نے کہا۔

"اب میں کس طرح بتاؤں"

"نہیں کسی طرح بتاؤ"

"پیارے میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی" وہ بولی "میں اس ڈوبتے ہوتے حسین سورج کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ قبر میں بھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی"

"سچ!"

"ہاں پیارے"

میں نے بے تحاشہ اس کا منہ چوم لیا۔

دفعتاً پھاٹک کے قریب غراہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا آج وہ رقیب روسیاہ پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا تھا —— میں اس کی اس جسارت کو کسی حال میں بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھا . . !

میں نے ہاتھ لگا کر اپنی دُم کڑی کی اور پھاٹک کی طرف لپکا . . کُتا دانت نکال نکال کر برابر غرّاتے جا رہا تھا . . . اپنی دُم ذرا اور کڑی کر کے میں نے بھی غرّانا شروع کر دیا . . . پھر ہم دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے . . . اُس نے میری ٹانگ پکڑی اور میں نے اس کی گردن پر منہ مارا . . .

"اَبے کیا سمجھتا ہے . . . آج مار ہی ڈالوں گا" میں نے ہانپتے ہوتے کہا۔

"اَبے جا جا . . . پہلے دُم تو سنبھال" وہ ہنس کر بولا۔

لڑتے وقت میری دُم ہاتھ سے چھُٹ جانے کی وجہ سے ڈھیلی ہو کر لٹک گئی تھی . . . میں نے جلدی سے دُم کڑی کی اور پھر لڑنے لگا۔ شور سن کر گھر والے ہماری طرف دوڑے . . . کُتا بھاگ کھڑا ہوا . . . میں بہت تھک گیا تھا۔ میں نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ میری کُتیا بھی اُسی کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی . . . یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا اور میں بیہوش ہو گیا۔

اس کے بعد مجھے کافی عرصے تک ایک عجیب و غریب قسم کی عمارت میں رہنا پڑا . . . اَب میں وہاں سے لوٹ آیا ہوں۔ میرا دل کافی ٹوٹ چکا ہے . . . دُنیا میری نظروں میں ویران ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب کسی کتیا سے عشق نہ کروں گا . اس سنگدل کو بھلا دینے کیلئے میں نے شراب پینی شروع کر دی ہے اور معاف کیجئے گا۔ میں اس وقت بھی نشے میں ہوں .

میں اس سے ملا

اداس ہوتا ہوں تو اناناس کے مربے کی تلاش ہوتی ہے نہ ملے تو پھر
خناس۔ آج تک یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ اداسی اور اناناس کے مربے
میں کیا رشتہ ہے اور اگر یہ نہ ملے تو خناس کیوں۔ ؟
بہرحال یہ خناس بعض اوقات بڑی مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔۔۔
غالباً ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔۔۔
بمبئی میں تھا اور اس دن بہت اداس تھا۔ معلوم نہیں کیوں اناناس
کا خیال آتے ہی ایک فلمی اداکارہ یاد آئی اور میں چل پڑا انٹرویو کے لئے۔
ان دنوں یہی مشغلہ تھا۔ فلم ایکٹرسوں سے ملتا اور ان ملاقاتوں کی
داستان لکھ کر ایک کپ چائے کے عوض کسی ایڈیٹر کی نذر کر دیتا۔
ہاں تو میں اس سے ملا۔ ملنے کے لئے اس قدر بے چین تھا۔
کہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اس کی۔۔۔ رہائش پہ پہنچ گیا۔

جب اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ 'خاص پرائیویٹ' حالت میں نظر آئی۔

ایک ٹائپ رائٹر سر پر رکھے میز پر کھڑی گنگنا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر میز سے اتری اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔

"اوہ تم آگئے!" کہتے ہوئے اس نے ٹائپ رائٹر میرے سر پہ دے مارا۔ ۔ ۔ پھر خود اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی اور لگی بیخ بیخ کر رونے۔

جب خوب سا رو چکی تو ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔

"آپ ۔ آپ کون ہیں ۔ !"

"جی میں انٹرویو کے لئے حاضر ہوا ہوں!" میں نے رومال سے پیشانی کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

"ارے توبہ ۔ میں آپ کو ہیرو سمجھی تھی!"

"ہیرو ۔ !"

"جی ہاں میں ریہرسل کر رہی تھی۔ معاف کیجئے گا!"

"کوئی بات نہیں!" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"تشریف رکھیے ۔ ۔ ۔"

"شکریہ!"

وہ بیحد سیدھی سادی معلوم ہوتی تھی، چونکہ اس کے کپڑوں سے ہلدی اور دھنیا اور سرسوں کے تیل کی بُو آ رہی تھی، اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ امورِ خانہ داری میں بھی بے حد دلچسپی لیتی ہے!

میں اس کی خوش اخلاقی پر عش عش کرنے کا ارادہ ترک کر کے اصل موضوع پر آ گیا۔

"یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں کس لئے حاضر ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

"جی بہت اچھی طرح . . . آپ سوالات کیجئے۔ لیکن یہ بتادینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں الجبرا میں ہمیشہ کمزور رہی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، میں ارتھمیٹک کے سوال کر دوں گا۔ آپ یہ بتائیے اگر "ا" ایک کام کو پانچ دن میں کرتا ہے تو "ب" جس کے کام کی رفتار پانچ سو میل فی گھنٹہ ہے "ا" کے ساتھ مل کر کتنے دنوں میں کرے گا جبکہ "ا" کے کام کی رفتار صفر ہے۔"

وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولی۔ "نہ میں "ا" کو جانتی ہوں اور نہ "ب" کو۔ کام اگر سیٹھ کے گھر ہوتا تو رات بھر میں ختم ہو جاتے گا۔ اور اگر کام کا تعلق ڈائریکٹر سے ہے تو کئی فلموں میں ایکسٹرا کی حیثیت سے کام کرنا پڑے گا۔ !"

"ویری گڈ" میں تقریباً اچھلتا ہوا بولا تھا یا بولتا ہوا اچھلا تھا اچھی طرح یاد نہیں۔

"اور کچھ؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ فلمی دنیا میں کس طرح آئیں؟"

"میں غالباً پہلے بذریعے ٹرین آئی۔ پھر وکٹوریا پر بیٹھی۔ اس کے

بعد چھوٹو بھائی کھٹ کھٹ بھائی کے ذریعے ڈائریکٹر بیکار تک پہنچی۔"

"آپ کی پہلی فلم کا نام"

"بیمار اُلو۔ !"

"پہلی بار آپ نے کیمرے کے سامنے کیا محسوس کیا۔ ؟"

"سیٹیاں، تالیاں اور گالیاں۔"

"آپ اتنی خوبصورت کیوں ہیں !" میں نے دانتوں میں انگلی دبا کر شرماتے ہوئے پوچھا۔

"جی . . . میں روز صبح دلکش صابن کھاتی ہوں !"

"ایک بات اور پوچھوں۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گی !"

"شوق سے پوچھئے !"

"آپ نے اتنی شادیاں کیوں کی ہیں"

"بات دراصل یہ ہے . . ." وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی "مجھے کُتوں سے زیادہ شوہر پسند ہیں۔"

"آخر کیوں۔"

"کُتے بھونکتے بہت ہیں اور کبھی کبھی کاٹ بھی لیتے ہیں !"

"آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں۔"

"ہسپتال میں !"

"اس وقت آپ کی عمر کیا ہے ؟"

"انیس سال۔"

"کیا آپ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں !"

" جی ہاں، اب ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ کیونکہ میرا بینک بیلنس شرافت کی حدود میں داخل ہو گیا ہے !"

" آپ کے والدین زندہ ہیں ؟"

" جی ہاں۔ !"

" وہ کیا کرتے ہیں !

" بچے پیدا کرتے ہیں !"

" آپ کے کتنے بچے ہیں !"

" سولہ عدد۔ !"

" اوہ ۔ !" میں مطمئن ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر وہ بولی "کچھ اور پوچھنا ہے آپ کو۔ !"

" آپ کا پہلا بچہ کس عمر میں پیدا ہوا تھا ؟"

" جب میں اُنیس سال کی تھی۔ !"

" دوسرا بچہ ۔ !"

" جب میں اُنیس سال کی تھی ۔ !"

" تیسرا بچہ !"

" جب میں اُنیس سال کی تھی۔ !"

" چوتھا بچہ۔ !"

چوتھا ہی نہیں بلکہ سولھواں بھی اُنیس ہی سال کی عمر میں پیدا ہوا تھا "!
"خوب - اچھا آپ کی نانی محترمہ کا کیا نام ہے ؟"
"شریف خواتین کے نام غیر مردوں کو نہیں بتاتے جاتے "
"اوہ معاف کیجیے گا !" میں نے نادم ہو کر کہا اور اس نے مجھے
تہہ دل سے معاف کر دیا۔
"آپ کے بچّے آپ کو کیا کہتے ہیں !" میں نے پوچھا۔
"آپا" جواب ملا۔
"ممّی کیوں نہیں کہتے - !"
"سمجھدار بچّے ہیں - !"
"فلمی دنیا میں آنے سے پہلے آپ کیا کرتی تھیں - !"
"یاد نہیں - !"
"پھر بھی - !"
"غالباً محبت کرتی تھی - !"
"ترکاریوں میں آپ کو کون سی ترکاری پسند ہے !"
"جسے چھیلنا نہ پڑے - !"
"آپ کو کبھی کبھی کھانسی بھی آتی ہے ؟"
"جی ہاں - !"
"آپ کا سر تو نہیں چکراتا "
"جی ہاں - کبھی کبھی چکراتا تو ہے "

"آنکھوں کے سامنے نیلی نیلی چنگاریاں تو نہیں اڑتیں؟"
"اکثر اڑتی ہیں!"
"کبھی سفید تق . . . مطلب یہ کہ کبھی سفید آم کھایا ہے، آپ نے!"
"جی ہاں اکثر کھانے کا اتفاق ہوا ہے!"
"اور لنگڑا ۔ !"
"وہ بھی کھایا ہے ۔ !"
"آپ کو ادب سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟"
"جی ہاں ۔ سیٹھ سے لے کر ٹرالی چلانے والے لڑکے تک کا احترام کرتی ہوں!"
"آپ کو ڈائریکٹروں میں کون سا سب سے زیادہ پسند ہے!"
"وہ جسے میرے بچوں کی تعداد معلوم نہ ہو!"
"بہت خوب ۔ اب میں جیومیٹری کے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں"
"شوق سے ۔ !"
"ایک اور صرف ایک دائرہ تین ایسے نقطوں سے گذر سکتا ہے جو ایک ہی خطِ مستقیم پر نہیں ہے ۔ یہ کس مسئلے کا دعویٰ عام ہے؟"
"میں اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی، کیونکہ ابھی میری عمر چوبیس سال سے کم ہے، کوئی دوسرا سوال پوچھئے شاید میری جیومیٹری بھی کمزور رہے ۔"

"بچپن میں آپ کن چیزوں کی شائق تھیں۔ !"

"زیادہ تر پتنگ اڑایا کرتی تھی ؟"

"صرف اڑاتی تھیں یا لڑاتی بھی تھیں ؟"

"میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ !"

"اوہ۔ لیکن یہی سوال تو انٹرویو کا حاصل ہے ؟"

"مجبوری ہے !"

"میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اس سوال کا جواب ضرور دیجئے۔ !"

"نہیں صاحب! واہ یہ اچھی رہی۔ !"

"آپ کو خدا کا واسطہ۔ !"

"بھئی واہ۔ یہ بھی کوئی بات ہے !"

"خیر آپ کی مرضی۔ !" میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"ارے۔ . . ارے۔ . . آپ رو رہے ہیں !"

"رو لینے دیجئے مجھے۔ !"

"بس اب خدا کے لئے چپ ہو جایئے۔ . . اچھا سُنیئے۔ . . میں بتاتی ہوں !"

"نہیں۔ نہیں۔ مت بتلایئے ! مجھے رو رو کر مر جانے دیجئے !"

"شیطان کے کان بہرے۔ . . !"

"شیطان کے کان بہرے !" میں خوشی سے چیخا !

"جی ہاں - !"

"ایک بار پھر کہئے - !"

"شیطان کے کان بہرے - !"

"کاش آپ زندگی بھر دُہراتی رہیں . . . اور میں سنتا رہوں

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں !"

وہ خوش ہو کر بولی -

"صد فی صد سچ - !"

"کچھ اور پوچھنا ہے آپ کو ؟"

"صرف ایک سوال - فی الحال آپ کا شوہر کون ہے - ؟"

"آج کل تو کوئی بھی نہیں ہے - !"

"کیا میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں - !"

"آپ کو شرم نہیں آتی' ایسی باتیں کرتے ہوتے !" اس -
دانتوں میں انگلی دبا کر پلکیں جُھکا لیں -

"معافی چاہتا ہوں - !"

"خیر - یہ بتایئے آپ کے پاس کتنی کاریں ہیں !"

"کاریں . . . گگ . . . کاریں !" میں نے آہستہ آہستہ ہ
شروع کیا -

"جی ہاں کاریں - !"

"جج - جی بتاتا ہوں - وہ کاریں - !"

اب میں دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا' میں نے سڑک پر چھلانگ لگا دی اور ایک کار دندناتی ہوئی مجھ پر سے گزر گئی۔

. . . . . .

قواعد اُردو

بچو! کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ تم گھر میں پٹتے کیوں ہو، تمہارے
بزرگ تمہارے مشوروں پر عمل کیوں نہیں کرتے ؟ تم آئے دن بیما
کیوں رہتے ہو ؟ اکثر تمہارا معدہ کیوں خراب رہتا ہے ؟

تم اگر سوچو تو یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی، لہٰذا میں تمہیں
بتاؤں گا. سنو! ان سب کی ایک ہی وجہ ہے، وہ یہ کہ تم قواعدِ اُردو سے
ناواقف ہو۔ پس قواعدِ اُردو وہ علم ہے جس کے نہ جاننے سے آدمی
لُولا، لنگڑا، گونگا، بہرا، اندھا۔ غرضیکہ بالکل اپاہج ہو جاتا ہے۔

اگر ہم قواعد اُردو کو بیچ سے پھاڑ ڈالیں تو اس کے دو حصے
جائیں گے۔ تب ہم ایک حصے کو علمِ صرف کہیں گے اور دوسرے کو
علمِ نحو۔

ابھی ہم تمہیں صرف علمِ صرف کے متعلق کچھ بتائیں گے۔ علمِ صرف میں
سب سے پہلی چیز 'لفظ' ہے۔ لفظ کے معنی لُغت میں، منہ سے کہ

ہر کے پھینکنے کے ہیں. مثلاً تھوک، بلغم اور قے وغیرہ۔ اگر کوئی تمہارے
نہ پر گھونسہ دے مارے اور تمہارا ایک دانت ٹوٹ کر گر پڑے تو
سے بھی لفظ ہی کہیں گے۔ دانت ٹوٹنے کے ساتھ ہی اگر خون نکل پڑے
ور درد بھی ہونے لگے تو خون اور درد کو معنی کہیں گے۔ کبھی کبھی ایسا
بی ہوتا ہے کہ دانت خود بخود ٹوٹ کر گر جاتے ہیں، نہ خون ہی نکلتا ہے
ور نہ درد ہی ہوتا ہے۔ ایسے دانتوں کو مہمل کہتے ہیں، جیسے بوڑھوں کے
انت۔

تعریف :۔ پس ثابت ہوا کہ وہ الفاظ جو معنی نہیں رکھتے، مہمل
ہلاتے ہیں اور معنی دار الفاظ کو کلمہ بھی کہتے ہیں۔

فائدہ :۔ اگر منہ میں ایک بھی لفظ نہ ہو تو حلوہ یا دودھ نصیب
ہوتا ہے۔

تنبیہ : دانتوں کی حفاظت کرنا، ہر ایک کا فرض ہے، ورنہ وہ
مہمل ہونے سے پہلے ہی لفظ بن جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ کالی نوس
منجن اور مسواک برش استعمال کرو۔

جملہ

تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جو بچے تم سے لڑائی میں جیت نہیں پاتے،
وہ تمہارے دانت کاٹ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بتیسوں دانت
استعمال کرتے ہیں۔ ایک دانت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ . . مگر جب
بتیسوں دانت استعمال کئے جاتے ہیں تو تم بلبلا اٹھتے ہو۔ پس ثابت ہوا کہ

الفاظ کا ایسا مجموعہ جس سے پوری پوری بات سمجھ میں آجاتے، جملہ کہلاتا ہے۔

کلمے کی قسمیں

تم یہ پڑھ چکے ہو کہ وہ لفظ جو معنی رکھتا ہے کلمہ کہلاتا ہے۔ اب ہم تمہیں کلمے کی پہلی پُشت سے روشناس کراتے ہیں۔

شجرۂ کلمہ

کلمہ

اسم	ضمیر	فعل	صفت	حرف

اسم اور اس کی قسمیں :۔ اسم وہ کلمہ ہے، جس کے بغیر زندگی تلخ ہو جاتے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ اسمِ معرفہ اور اِسم نکرہ۔ اگر تم کسی سے اس کا اسم شریف دریافت کرو اور وہ جواب دے تو ہم اسے اسمِ معرفہ کہیں گے، جیسے رام کھلاون، محمد فاضل، ایڈورڈ ہفتم وغیرہ۔ مونگ پھلی وغیرہ۔

فائدہ :۔ اکثر اسم شریف دریافت کرنے پر لوگ رشتہ دار نکل آتے ہیں۔

تنبیہ : خبردار، کبھی کسی ایسے شخص سے اسم شریف نہ پوچھنا جس سے تمہاری اچھی طرح جان پہچان نہ ہو۔ ورنہ تمہیں معلوم کرکے

بہت مایوسی ہو گی کہ جسے تم اِسم نکرہ سمجھ رہے تھے، وہ جملہ نکلا۔

اسم کی قسمیں، گنتی کے لحاظ سے ؛ گنتی کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ واحد۔ ۲۔ جمع۔

واحد :۔ وہ اسم ہے جو کسی تنہا چیز کے لئے بولا جاتا ہے جیسے اُلّو، ٹماٹر، اونٹ، اُود بلاؤ۔

جمع : وہ اسم ہے، جو ایک سے زیادہ چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے کئی اُلّو، کئی ٹماٹر، کئی اونٹ، کئی اُود بلاؤ۔

تنبیہ : یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ دنیا میں بہتیری ایسی چیزیں بھی ہیں، جو بیک وقت واحد اور جمع دونوں ہوتی ہیں جیسے پائجامہ جو نیچے سے جمع اور اوپر سے واحد ہوتا ہے۔

اِسم کی قسمیں بلحاظِ جنس :۔ اللہ پاک بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے ہر نر کے لئے مادہ اور ہر مادہ کے لئے نر پیدا کیا ہے۔ اس لئے جنس کے لحاظ سے اس کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ۱۔ مذکر۔ ۲۔ مؤنث۔

مذکر :۔ ایسے اِسموں کو مذکر کہتے ہیں، جو نر کے لئے بولے جائیں۔ جیسے حرام زادہ، اُلّو کا پٹھا اور سُوَر کا بچّہ۔

مؤنث : ایسے اسموں کو مؤنث کہتے ہیں، جو مادہ کے لئے بولے جائیں جیسے حرامزادی، اُلّو کی پٹھی، سُوَر کی بچّی۔

ضمیر اور اس کی قسمیں : ضمیر بہت فائدہ مند چیز ہے۔ اگر تم خوف کی وجہ سے کسی کا اسم شریف نہ بتا سکو تو اس کی جگہ بے دھڑک

ضمیر استعمال کر سکتے ہو۔ مثلاً والد صاحب کی جگہ "وہ" اور ڈنڈے کی
جگہ "یہ"
اس کی تین قسمیں ہیں۔ متکلم، حاضر، غائب۔
متکلم، ہیڈ ماسٹر صاحب کی بید کو کہتے ہیں اور حاضر، غائب سمجھنے کے
لئے روزانہ اپنی کلاس کے رجسٹر کا مطالعہ کیا کرو۔
فعل اور اس کی قسمیں :۔ فعل وہ کلمہ ہے جس کی جگہ مشینیں لے
لیتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ بہ لحاظ معنی فعل کی دو قسمیں ہیں ۔ ۔ ۔ فعل لازم
اور فعل متعدی۔
اگر تم کسی گدھے کو چھیڑو تو اُسے لازم ہے کہ تمہارے ایک عدد
لات رسید کر دے، بس لات مارنے کے فعل کو فعل لازم کہتے ہیں۔ کلاس
میں اگر تم سے فعل لازم کی تعریف پوچھی جاتے تو فوراً ایک گدھا تلاش
کرو، اگر گدھا نہ ملے تو تم خود ہی ماسٹر صاحب کو فعل لازم اچھی طرح سمجھا
اگر امتحان میں ایسا کرو گے تو ہمیشہ اوّل آؤ گے۔
فعل متعدی کو مرضِ متعدی بھی کہتے ہیں، جیسے تپ دق ہو جانا، ہیضہ
ہونا، طاعون آنا، گردن توڑ بخار آنا وغیرہ۔
زمانہ : فعلوں میں زمانے ۔ ۔ ۔ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ
تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ۱۔ ماضی۔ ۲۔ حال۔ ۳۔ مستقبل۔
حال : قوالی سنتے سنتے بعض بزرگ اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔
حال کہلاتا ہے۔ اکثر بڑے کمرے کو بھی کہتے ہیں۔ مگر اسی صورت

جب اُس میں ہائے حطی کے بجائے ہائے ہوز ہو۔

مستقبل : ہر وہ چیز جو قطعی لغو ہو مستقبل کہلاتی ہے، بلکہ بعض علماً کی رائے تو یہ ہے کہ مستقبل کوئی چیز ہی نہیں ہے، اس لئے جو چیز تمہاری سمجھ میں نہ آئے، اُسے مستقبل ہی سمجھو۔

ماضی : یہ ایک قسم کا نشہ ہے، مختلف قسم کی منشیات کی آمیزش سے کئی قسم کے ماضی بنتے ہیں۔

۱۔ ماضی قریب : ہلکا سا نشہ، جو کسی سخت قسم کے تمباکو سے آ جائے۔

۲۔ ماضی بعید : شراب میں افیون گھول کر پینے سے جو نشہ آ جائے۔

۳۔ ماضی شکیہ :۔ وہ شخص جو خود کو شراب پیتا ہو، لیکن اپنی بیوی کے چال چلن پر شک ہونے کی بنا پر اُسے قتل کر کے کہیں فرار ہو جائے۔ ایسے فعل کو ہم ماضی شکیہ کہیں گے۔

ماضی استمراری :۔ یہ کم از کم پندرہ قسم کی منشیات کی آمیزش سے تیار ہوتا ہے۔ بعض اوقات اسے استمراری بندوبست بھی کہتے ہیں۔

ماضی تمنائی :۔ شراب کی تمنا دل میں لئے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو جانا۔

ماضی شرطی :۔ شرط بد کر شراب پینا۔

تنبیہ : خبردار، کلاس میں ماضی د حال کی مشق ہرگز نہ کرنا، ورنہ نتیجے کے تم خود ذمے دار ہو گے۔

مضارع :۔ یہ ایسا فعل ہے کہ اس سے حال اور مستقبل دونوں سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی ایسی اچھل کود جو قطعی سمجھ میں نہ آتے۔

تنبیہ :۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم کسی لیڈر کو تقریر کرتے دیکھ کر، اس کے فعل کو مضارع سمجھ لو۔ ممکن ہے جس زبان میں وہ تقریر کر رہا ہو وہ تمہاری سمجھ سے بالاتر ہو۔

فعل امر : یہ ایسا فعل ہے جسے تم ہرگز پسند نہ کروگے، اس لئے اس کی تعریف نہیں کی جاتے گی۔

فعل نہی :۔ چھٹی ہونے سے قبل ہی اسکول سے کھسک لینے کو فعل نہی کہتے ہیں۔

تنبیہ : فعل نہی کی مشق روزانہ کرو، ورنہ تمہارے پاس ہونے کی ذمے داری نہ لی جاتے گی۔

اس بات کا ہمیشہ خیال رکھو کہ فعل کے ساتھ فاعل کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر کسی وجہ سے تم فاعل نہ مہیا کر سکو تو اسی وقت بری الذمہ ہو سکتے ہو، جب فاعل کا میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کر دو، اور ہاں دیکھو، بعض اوقات فعل اور فاعل کے ساتھ ایک عدد مفعول بھی درکار ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر گھبرانا نہیں چاہتیے۔ ایسی صورت میں ہمیشہ فاعل کو رشوت دے کر منالو۔ خدا نے چاہا تو وہ خود ہی اپنے مفعول ہونے کا بھی اعلان کر دے گا۔ اس لئے کہ رشوت بڑے بڑے دیش سیوکوں تک کو سیدھا کر دیتی ہے۔

صفت

۱۔ کلوٹی لڑکی۔
۲۔ ولایتی اُلو
۳۔ پانچویں بندریا۔

اُوپر کی مثالوں میں لڑکی، اُلو اور بندریا کے متعلق کچھ کہا گیا ہے، جو کچھ کہا گیا ہے، وہی اُن تینوں کی صفت ہے، جس کی صفت بیان کی جاتی ہے، اُسے موصوف کہتے ہیں۔ اس طرح لڑکی، اُلو اور بندریا موصوف ہوتے اور کلوٹی، ولایتی اور پانچویں صفت۔ پس ثابت ہوا کہ وہ کلمہ جو کسی کی چُغلی کھائے، اُسے صفت کہتے ہیں اور جس کی چُغلی کھائی جائے، اُسے موصوف کہتے ہیں۔

تنبیہہ:۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ اللہ پاک چُغل خور کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ لہٰذا جب کبھی کلاس میں صفت پڑھائی جانے لگے تو فوراً واک آؤٹ کر جاؤ۔ اگر اس پر بھی ٹیچر باز نہ آئے تو اسکول میں اسٹرائیک کرا دو۔

صفت کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ صفت مشبہ، ۲۔ صفت نسبتی۔
۳۔ صفت عددی۔

وہ صفت، جو ہمیشہ اپنے موصوف کی چُغلی کھاتی رہے، صفت مشبہ کہلاتی ہے۔

وہ صفت جو صرف نسبت ہی نہیں، شادی بھی کرا دے صفت نسبتی کہلاتی ہے۔

صفت عددی وہ نامعقول صفت ہے، جس میں اعداد اور ہندسے پلٹے جاتے ہیں۔ تم اس کے متعلق کچھ معلوم کرنا ہرگز پسند نہ کروگے۔

حرف

حرف وہ کلمہ ہے، جو اُردو کی ابتدائی کتابوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

حروف کی قسمیں ، حرف جار۔ اس کو مرتبان بھی کہتے ہیں۔ یہ اچار چٹنی اور مربے وغیرہ رکھنے کے کام میں آتا ہے۔

حرف ندا :۔ اس کو کوہِ ندا بھی کہتے ہیں۔ اس کا پتا طائی کے بیٹے حاتم نے لگایا تھا۔

حرفِ ندبہ :۔ وہ کلمہ ہے جسے حاملہ عورتیں بکثرت استعمال کرتی ہیں جیسے مٹی، لیموں، انگور وغیرہ، اس کلمے کو استعمال کرنے والے کو مندوب کہتے ہیں۔ بعض علما کا خیال ہے کہ مندوب نہیں مجذوب کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حرفِ عطف :۔ وہ کلمہ ہے جسے کسی کا سایۂ عاطفت نہ نصیب ہو۔

حرف استثنا : بات کرتے وقت چھینک یا کھانسی تو اسے حرف استثنا کہیں گے۔

حرف علت :۔ یہ دراصل حرفِ علالت تھا۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے حرف علت رہ گیا۔ مراد اس سے وہ کلمہ ہے، جو مرنے کے بعد بیمار دن کو کھلایا جاتا ہے تاکہ قبر میں بھی کوئی بیماری نہ ہونے پلتے۔

حرفِ شرط اور جزا :۔ وہ کلمہ جو شرط بد کر دوڑنے پر گر پڑنے کے

بعد مُغَّہ سے نکلے، حرفِ جزا کہلاتا ہے۔ اگر گرِ پڑھنے والے کے والدین آپس میں شرط بد کر اُسے دوبارہ دوڑا دیں تو ہم اسے حرفِ شرط کہیں گے۔

بچّو! علمِ صرف کا بیان ختم ہو گیا۔ اب تمہیں تحلیل صرفی کرنا سکھایا جائے گا۔ تحلیل صرفی کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک جملہ لکھ لو۔ پھر اس کے ٹکڑے کرو۔ اگر ٹکڑے برابر کے نہ ہوں تو کسی بڑھئی سے مدد لو۔ اگر جُملہ ملائم ہو تو ٹکڑے کرنے سے بہتر یہ ہوگا کہ اس کا قیمہ کرلو۔ اس قیمے کو تحلیلِ صرفی کہیں گے

قواعدِ اُردو کا پہلا حصّہ ختم ہوا۔ دوسرے حصّے میں تم علمِ نحو کا بیان پڑھو گے۔ اسے پڑھ کر تم اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی توانائی محسوس کرو گے۔ تم نے حکیم اجمل خان مرحوم کا نام ضرور سنا ہوگا، ان کے دواخانے کی ساری دوائیں، ترکیبِ نحوی ہی سے تیار کی جاتی تھیں۔ اسٹیفن نے جو انجن تیار کیا تھا، اس میں بھی ترکیب نحوی لگائی تھی۔ مشہور سائنسدان فرنیکلن، ٹوسٹ پر مکھّن کے بجائے ترکیبِ نحوی لگا کر کھاتا تھا، اسی لئے . . . وہ آسمان پر چمکنے والی بجلی کو گرفتار کر کے تمہاری تاریک گلیوں کو چمکانے میں کامیاب ہوا۔ زیادہ تعریف خلافِ قانون ہے۔ اگر اس کے آگے معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری لکھی ہوئی کتاب قواعدِ اُردو کا دوسرا حصّہ منگا کر پڑھو۔ تمام پرائیویٹ حالات کھول کھول کر لکھ دیئے گئے ہیں ؂

ساڑھے پانچ بجے

اسٹار کا کرائم رپورٹر انور اپنی میز پر تنہا تھا لیکن اس کیفے میں تنہا نہیں
آیا تھا۔ دو افراد اور بھی تھے اس کے ساتھ۔ وہ دونوں اسے باہر فٹ پاتھ پر
ملے تھے۔ علیک سلیک ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ ان کے
ساتھ کافی پیئے اور بے چارہ انور سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ وہ دونوں کون ہیں۔ کب کی
شناسائی ہے اور ان سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ نہ ان کے نام یاد آسکے
اور نہ یادداشت کی سطح پر شناسائی ہی کی کوئی لہر پیدا ہو سکی۔

لیکن وہ اسے کیفے میں کھینچ ہی لائے تھے اور وہ چلا آیا تھا محض
معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔

ان میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور دوسرا جوان۔ وہ انور سے اس
کی شاندار رپورٹنگ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے تھے۔ پھر رپورٹنگ کا فن
زیر بحث آیا تھا۔ مغرب کے مشہور کرائم رپورٹرز کے حوالے دیئے گئے تھے۔
اور زیادہ تر گفتگو ادھیڑ آدمی نے کی تھی۔

انور بھی اسی طرح پیش آرہا تھا جیسے وہ اس کے لئے اجنبی نہ ہوں
لہذا پھر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ ان کے نام معلوم کرنے کی کوشش کرتا
خاصا وقت گزارنے کے بعد ادھیڑ عمر آدمی نے ویٹر کو بلا کر بل طلب کیا تھا

ادائیگی کر کے انور سے بولا تھا۔" مسٹر انور میں نے آپ کا پورا ایک گھنٹہ ضائع کر دیا۔ ہم پانچ بجے ملے تھے اور اب چھ بج رہے ہیں کبھی ہماری طرف بھی آئیے۔ یہ رہا میرا پتہ۔"

اور پھر اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر انور کو تھما دیا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں اُسے متحیر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

اور اب وہ تنہا بیٹھا اس وزیٹنگ کارڈ کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ قطعی اجنبی تھا انور کے لیئے یوں تو کارڈ پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی شخصیت سے آگاہ ہو گیا تھا لیکن پہلے کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو۔ ناممکن...!

انور اس کا نام ضرور سنتا رہا تھا۔ صورت آشنا نہیں تھا... پھر اس اچانک ملاقات کا مقصد؟

دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہا تھا پھر کیفے سے اٹھ گیا تھا۔

فلیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس واقعے کی اہمیت دوسرے ذہنی الجھاوؤں کے گرداب میں پڑ کر غرق ہو گئی تھی اور یہ روزانہ زندگی کے الجھاوے تھے۔ پچھلی شام رشیدہ سے زبردست جنگ ہوئی تھی اتنی زبردست کہ آج اس نے آفس میں بھی اسے لفٹ نہیں دی تھی۔ اس کے برخلاف ان لوگوں سے ہنس ہنس کر گفتگو کرتی رہی تھی۔ جن کی طرف وہ رخ کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ انور کو مزید تاؤ دلائے لیکن وہ نہ صرف پُرسکون رہا تھا بلکہ بالکل برف ہی ہو جانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ ویسے بھی زندگی کی حرارت کچھ کم ہی محسوس ہو رہی

تھی کیونکہ صبح ناشتہ نہیں نصیب ہوا تھا۔ وجہ ظاہر تھی رشیدہ نے پوچھا ہی نہ
تھا۔ ورنہ یہ معمولات میں سے تھا کہ وہ خود آکر اسے اپنے فلیٹ میں لے جا
تی اور ناشتہ وہیں ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا دفتر سے قریبی ہوٹل میں کھاتے او
رات کا کھانا کبھی کسی ہوٹل اور ادر کبھی رشیدہ کے ساتھ۔

رشیدہ کا فلیٹ مقفل نظر آیا تھا۔ وہ کسی مندی بچے کے سے انداز میں
گردن اکڑائے ہوئے اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

فلیٹ میں پہنچ کر لباس بھی تبدیل نہیں کر پایا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔
ہونٹ سکوڑ کر اس نے ریسیور اٹھایا تھا۔

دوسری طرف سے اس کے اخبار کے ایڈیٹر کی آواز آئی "انور ڈائمنڈ
اسکوائر میں ایک قتل ہو گیا ہے۔ بلاک نمبر دن کے چودھویں فلیٹ میں!"

"میں آف ڈیوٹی ہوں۔"

"اس کے باوجود بھی تمہارا پہنچنا ضروری ہے معاملہ پیچیدہ ہے
شہر کی ایک مشہور عورت... !"

"قتل کر دی گئی؟"... انور نے طویل سانس لے کر پوچھا۔

"شاہینہ سلطان..."

"کیا؟" انور چونک پڑا "رضی سلطان کی بیوی تو نہیں..."

"وہی... وہی..."

"ڈائمنڈ اسکوائر کے کسی فلیٹ میں اس کا کیا کام وہ لوگ تو ہائی
سرکل ایونیو میں رہتے ہیں۔"

"یہی پیچیدگی ہے۔ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ وہ اسی فلیٹ میں رہتی تھی۔"
"قتل کب ہوا!..."
"برابر کے فلیٹ والوں نے ساڑھے پانچ بجے فائر کی آواز سنی تھی۔"
"اچھی بات ہے میں جا رہا ہوں۔" انور نے تیزی سے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا تھا۔

ریسیور رکھ کر اس نے کوٹ کی جیب سے وہی وزیٹنگ کارڈ نکالا جو کچھ دیر پہلے کیفے جیفری میں اسے دیا گیا تھا۔ کارڈ پر واضح حروف میں "رضی سلطان" چھپا ہوا تھا... رضی سلطان... اس نے طویل سانس لی... رضی سلطان جس نے پانچ بجے سے چھ بجے تک کا عرصہ اس کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ شوہر تھا قتل کر دی جانے والی عورت شاہینہ کا۔ تو یہ چکر تھا اس لئے اس نے وہ ایک گھنٹہ اس کے ساتھ گزارا تھا۔

ڈائمنڈ اسکوائر تک پہنچنے میں پندرہ منٹ صرف ہوئے۔

یہاں پولیس موجود تھی انور اپنا کارڈ دکھاتا ہوا جائے واردات تک پہنچ گیا۔

محکمہ سراغرسانی کے انسپکٹر ملک نے اسے دیکھ کر سر کو جنبش دی تھی اور تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔

انسپکٹر ملک سے اس کے تعلقات اچھے تھے اور کبھی کبھی وہ خود ہی اسے فون کر کے موقعہ واردات پر بلا لیا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے اس رویے میں انسپکٹر آصف سے اس کی ناچاقی کو بھی دخل رہا ہو۔

"میں نے ہی تمہارے ایڈیٹر کو اطلاع دی تھی۔" اس نے کہا
"... میں ہمیشہ تمہارے لئے مواد فراہم کرتا رہا ہوں۔"
"شکریہ!" انور سے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔
"تمہارے شایان شان کہانی بن سکے گی۔ اگر کوشش کرو؟"
"کوشش!" انور نے حیرت سے کہا۔ "افسانہ نگار نہیں رپورٹر ہوں

...ب..."

"لاش دیکھو گے؟"

"ضرور..."

لاش کے سلسلے میں کوئی بھی پیچیدگی سامنے نہ آسکی۔ گولی پیشانی پر لگی تھی۔ فرش پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گولی لگنے کے بعد خاصی دیر تک فرش پر تڑپتی رہی ہو۔ صحت مند اور جوان عورت تھی۔ خوبصورت بھی تھی۔ آلہ قتل موقعہ واردات پر نہیں ملا تھا۔ کمرے میں کسی قسم کی ابتری بھی نہ ملی سنگھار میز پر آرائش کی ساری چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔

"برابر والے فلیٹ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے فائر کی آواز ٹھیک ساڑھے پانچ بجے سنی تھی۔" انسپکٹر ملک نے کہا۔

"گویا انہوں نے فائر کی آواز سن کر گھڑی دیکھنا ضروری سمجھا تھا۔"

"نہیں یہ بات نہیں گھر کے کسی فرد کو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے گھر سے باہر جانا تھا۔ اس لیے وہ دیر سے بار بار گھڑی دیکھتا رہا تھا۔"

"لاش کس وقت دریافت ہوئی ہے؟"

"فائر کے بعد ہی انہوں نے چیخیں بھی سنی تھیں۔ فلیٹ کا دروازہ اندر سے
مقفل نہیں تھا۔ وہ اندر پہنچے تھے اور انہوں نے شاہینہ کو تڑپتے دیکھا تھا۔ پھر قبل
اس کے کہ وہ کچھ کرتے۔ وہ ختم ہو گئی۔"

"تو گویا قاتل ان کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گیا تھا۔"

"ظاہر ہے۔"

"فائر کی آواز اور ان کے وہاں پہنچنے کے درمیان کتنا وقفہ متعین کیا
ہے آپ نے...؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک منٹ"

"اور ایک منٹ میں قاتل اتنی کامیابی سے فرار ہو گیا..."

"یہی تو حیرت انگیز ہے۔"

"اس کے شوہر کو اطلاع ہوئی یا نہیں؟"

"پتا نہیں، وہ کہاں ہے؟"

"کیا پڑوسیوں کے بیان کے مطابق یہ رضی سلطان ہی کی بیوی ہے"۔

"وہ یہی کہتے ہیں کہ رضی سلطان سے تعلقات خراب ہو جانے کے بعد وہ یہیں
مقیم تھی۔ دن بھر باہر رہتی تھی اور رات گئے واپس آتی تھی۔"

"تنہا...!"

"ہاں، وہ یہی کہتے ہیں کہ کبھی کوئی مرد اس کے فلیٹ میں نہیں دیکھا گیا۔"

"حالانکہ نیک نام عورت نہیں تھی!" انور نے ملک کی آنکھوں میں دیکھتے
ہوئے کہا۔

"اور اسی وجہ سے ازدواجی تعلقات بہتر نہیں تھے۔"

"یعنی طلاق کے بغیر علیحدگی ہوئی تھی۔"

"ابھی تک کی پوچھ گچھ کا ماحصل یہی ہے۔" انسپکٹر ملک نے کہا۔
"اگر اجازت ہو تو میں بھی پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کر لوں۔"

"ضرور۔ ضرور!"

انور کے اپنے ذرائع تھے جن کی بنا پر آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر اس نے معلوم کر لیا تھا کہ رضی سلطان اس وقت کہاں موجود ہے۔

پھر وہ ہائی سرکل نائٹ کلب جا پہنچا تھا۔ رضی سلطان اپنی میز پر تنہا تھا شاید رات کے کھانے کے بعد کافی پی رہا تھا۔

انور کو قریب دیکھ کر بری طرح چونکا اور پھر اس کے چہرے پر ایسے تاثر نظر آئے جیسے خفت سی محسوس کر رہا ہو۔

انور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔

"کافی منگواؤں مسٹر انور۔" وہ جلدی سے بولا۔ "یا پہلے کھانا کھائیں گے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید ابھی تک آپ کو اطلاع نہیں ملی۔ حالانکہ یہ ساڑھے پانچ بجے کا واقعہ ہے اور اب آٹھ بج رہے ہیں..."

"تو کیا؟... وہ ہو ہی گیا جس کا خدشہ تھا؟"

"میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھا۔"

"آپ نے ساڑھے پانچ بجے کا حوالہ دیا تھا۔"

"ہاں... تو پھر؟ آپ کی دانست میں ساڑھے پانچ بجے کس بات کا خدشہ تھا"
اس نے جھک کر آہستہ سے پوچھا۔ "مسٹر انور کیا میری بیوی ساڑھے
پانچ بجے قتل کر دی گئی ہے؟"

انور کو اس براہِ راست سوال کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اثبات میں سر کو
جنبش دی اور اسے بغور دیکھتا رہا۔

"غالباً اب یہ بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ آج میں خواہ مخواہ آپ
سے کیوں مل بیٹھا تھا۔"

"نہیں بات تو سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ارے اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم دونوں کے تعلقات اتنے کشیدہ
تھے کہ پولیس کے علم میں آتے ہی میری ذات شبہے سے بالاتر نہ رہے گی اسی
لئے میں نے پانچ سے چھ بجے تک کا وقت آپ کے ساتھ گزارا تھا۔"

"لیکن آپ کو علم تھا کہ آپ کی بیوی ساڑھے پانچ بجے قتل کر دی جائے گی۔"

"جی ہاں آخری دھمکی یہی ملی تھی۔"

"دھمکی!... ذرا وضاحت کیجئے۔"

رضی سلطان نے سگریٹ کا پیکٹ انور کی طرف بڑھایا۔

"شکریہ! میں اپنا برانڈ ہی پیتا ہوں۔" انور نے خشک لہجے میں کہا۔

رضی سلطان نے اپنے لئے سگریٹ منتخب کر کے سلگایا اور پے در پے
کئی کش لئے کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔ "لاش کہاں ملی ہے؟"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"سب کچھ آپ کو بتا دوں گا مسٹر انور۔ مجھے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو مجھے آپ کی شکل میں مل گیا ہیں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ہفتے سے کہاں تھی۔"

"کیا آپ کے ساتھ نہیں تھیں"۔

"ہرگز نہیں! ایک ہفتے سے میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی"۔

"لیکن میری معلومات کے مطابق انہوں نے چند ماہ پہلے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ڈائمنڈ اسکوائر بلاک وَن کے چودھویں فلیٹ میں مقیم تھیں"۔

"چند ماہ والی بات غلط ہے! صرف ایک ہفتے سے غائب تھی"۔

"ایک ہفتے سے قبل راتیں گھر پر ہی گزرتی تھیں"۔

"جی ہاں... قطعی..."

"بڑی عجیب بات ہے۔ فلیٹ والے پڑوسیوں نے بتایا ہے کہ وہ دن بھر غائب رہتی تھیں اور رات گئے واپس آتی تھیں اور رات فلیٹ ہی میں گذارتی تھیں"۔

"نصف درجن سے زائد ملازمین میرے گھر میں دن رات موجود رہتے ہیں، آپ اُن سے پوچھ سکتے ہیں"۔

"واقعی بڑی عجیب بات ہے لیکن رضی صاحب مجھے ابھی تک اپنی بات کا جواب نہیں ملا"۔

"اوہ جی ہاں۔ اب سنیے! ایک ہفتہ پہلے وہ اچانک غائب ہو گئی اور جب پوری رات گزر جانے کے بعد بھی واپس نہ آئی تو تشویش لازمی تھی۔ اپنے طور پر تلاش کرتا رہا۔ تین دن گزر گئے لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ مجھے علم ہے کہ پولی

شہر میں اس عورت کے چرچے تھے اس لئے مناسب نہ معلوم ہوا کہ اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں درج کراتا۔ بہرحال چوتھے دن ایک ٹائپ کیا ہوا غیر دستخط شدہ خط ملا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ شاہینہ کو اغوا کیا گیا ہے، واپسی دو لاکھ روپے کی ادائیگی میں ہو سکے گی اور پولیس کو اطلاع دینے کی صورت میں اسے قتل کر دیا جائے گا۔ پھر ادائیگی کے مطالبے کی گمنام کالیں آتی رہیں۔ میرا خیال تھا کہ خود شاہینہ ہی نے یہ ڈھونگ رچایا ہے کیونکہ میں نے ان دنوں اسے پیسوں سے تنگ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر کوئی حد بھی ہو۔ کوئی کہاں تک برداشت کر سکتا ہے۔ بے راہ روی کو۔ اور وہ میری ہی کمائی سے مجھ پر ستم ڈھاتی تھی۔ لہٰذا مجھے وہ خود اسی کی حرکت معلوم ہوئی تھی۔ دو لاکھ اس طرح وصول کرے گی اور گھر واپس آجائے گی۔"

انور نے طویل سانس لے کر سر کو جنبش دی، اور رضی سلطان کہتا رہا

"کل کی بات ہے دوسرا ٹائپ کیا ہوا خط ملا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر کل تین بجے تک بتائی ہوئی جگہ پر رقم نہ پہنچائی گئی تو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے شاہینہ کو گولی مار دی جائے گی۔"

"اس پر بھی آپ یہی سمجھتے رہے تھے کہ یہ حرکت خود شاہینہ ہی کی ہے۔" انور نے سوال کیا۔

"نہیں مسٹر انور حقیقت یہ ہے کہ اس خط کے ملنے پر میں ڈگمگا گیا تھا۔"

"تب تو آپ کو پولیس سے ضرور رابطہ قائم کرنا چاہیئے تھا۔"

"اگر میں اس ذلیل عورت کی زندگی چاہتا ہوتا تو ضرور کرتا۔"

"سب کچھ آپ کو بتا دوں گا مسٹر انور، مجھے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو مجھے آپ کی شکل میں مل گیا ہے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ہفتے سے کہاں تھی؟"

"کیا آپ کے ساتھ نہیں تھیں؟"

"ہرگز نہیں! ایک ہفتے سے میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔"

"لیکن میری معلومات کے مطابق انہوں نے چھ ماہ پہلے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ڈائمنڈ اسکوائر بلاک دن کے چودھویں فلیٹ میں مقیم تھیں۔"

"چھ ماہ والی بات غلط ہے! صرف ایک ہفتے سے غائب تھی۔"

"ایک ہفتے سے تین راتیں گھر پر ہی گزرتی تھیں۔"

"جی ہاں... قطعی..."

"بڑی عجیب بات ہے رفلیٹ والے پڑوسیوں نے بتایا ہے کہ وہ دن کو غائب رہتی تھیں اور رات گئے واپس آتی تھیں اور رات فلیٹ ہی میں گذارتی تھیں۔"

"نصف درجن سے زائد ملازمین میرے گھر میں دن رات موجود رہتے ہیں آپ اُن سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"واقعی بڑی عجیب بات ہے لیکن رضی صاحب مجھے ابھی تک اپنی بات کا جواب نہیں ملا۔"

"اوہ جی ہاں۔ اب سنیے! ایک ہفتہ پہلے وہ اچانک غائب ہو گئی اور جب پوری رات گزر جانے کے بعد بھی واپس نہ آئی تو تشویش لازمی تھی۔ اپنے طور پر تلاش کرتا رہا۔ تین دن گزر گئے لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ مجھے علم ہے کہ بہ

شہر میں اس عورت کے چرچے تھے اس لئے مناسب نہ معلوم ہوا کہ اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں درج کراتا۔ بہرحال چوتھے دن ایک ٹائپ کیا ہوا غیر دستخط شدہ خط ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ شاہینہ کو اغوا کیا گیا ہے، واپسی دو لاکھ روپے کی ادائیگی میں ہو سکے گی اور پولیس کو اطلاع دینے کی صورت میں اسے قتل کر دیا جائے گا۔ پھر ادائیگی کے مطالبے کی گمنام کالیں آتی رہیں۔ میرا خیال تھا کہ خود شاہینہ ہی نے یہ ڈھونگ رچایا ہے کیونکہ میں نے ان دنوں اسے پیسوں سے تنگ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر کوئی حد بھی ہو۔ کوئی کہاں تک برداشت کر سکتا ہے۔ بے راہ روی کو اور وہ میری ہی کمائی سے مجھ پر ستم ڈھاتی تھی۔ لہٰذا مجھے وہ خود اسی کی حرکت معلوم ہوئی تھی۔ دو لاکھ اس طرح وصول کرے گی اور گھر واپس آجائے گی۔"

انور نے طویل سانس لے کر سر کو جنبش دی، اور رضی سلطان کہتا رہا "کل کی بات ہے دوسرا ٹائپ کیا ہوا خط ملا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر کل تین بجے تک بتائی ہوئی جگہ پر رقم نہ پہنچائی گئی تو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے شاہینہ کو گولی مار دی جائے گی۔"

"اس پر بھی آپ یہی سمجھتے رہے تھے کہ یہ حرکت خود شاہینہ ہی کی ہے۔" انور نے سوال کیا۔

"نہیں مسٹر انور حقیقت یہ ہے کہ اس خط کے ملنے پر میں ڈگمگا گیا تھا۔"

"تب تو آپ کو پولیس سے ضرور رابطہ قائم کرنا چاہئے تھا۔"

"اگر میں اس ذلیل عورت کی زندگی چاہتا ہوتا تو ضرور کرتا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ حقیقت ہوتی یا نہ"

"یعنی آپ چاہتے تھے کہ کوئی اسے اس طرح ختم کردے کہ نہ آپ پرا
آئے اور نہ آپ کے ہاتھ آلودہ ہوں۔"

"آپ نے میرے خیال کی پوری پوری ترجمانی کی ہے مسٹر انور۔"

"اور اب میں اس بات کی شہادت دوں گا کہ آپ نے ایک گھنٹہ میرے
ساتھ گزارا تھا جس کے دوران میں وہ قتل ہوئی ؟"

"یہ غلط تو نہیں ہے مسٹر انور۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ غلط ہے لیکن آپ بہرحال اس کی موت کے خواہاں"

"مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔"

"قانون اسے بھی نظرانداز نہیں کرے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"خدا جانے... میں اس کی موت کا خواہاں تھا لیکن میں نے اسے قتل نہیں"

"درست۔ فائر کی آواز ساڑھے پانچ بجے سنی گئی تھی اور اس وقت آپ میرے
ساتھ کافی پی رہے تھے۔"

"قتل میں میرا ہاتھ بھی نہیں ہے مسٹر انور۔ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ میں کوئی
قاتل مقرر کرکے آپ کے ساتھ کافی پینے بیٹھ گیا تھا۔ قتل کی سازش کا الزام بھی
مجھ پر نہیں آسکتا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات... لیکن رضی صاحب! ایک بہت بڑا سوالیہ نشان پھر میرے ذہن میں ابھر رہا ہے۔"

"ہاں... ہاں... کہئے۔"

"آپ مقتولہ سے بیزار تھے؟"

"اس حد تک کہ واقعی قتل کر دینے کو دل چاہتا تھا...!"

"پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے اسے طلاق نہیں دے دی۔"

"سامنے کی بات ہے!" رضی سلطان سر ہلا کر بولا۔ "لیکن شاید آپ اس کی ہسٹری اور میری ایک مجبوری سے واقف نہیں ہے۔ اگر طلاق کی تحریک میری طرف سے ہوتی تو میں بالکل کنگال ہو جاتا۔"

"کیا ساری جائداد مقتولہ کے نام تھی؟"

"نہیں یہ ایک تباہ کن وصیت کی بنا پر ہوتا۔ اب کم از کم آپ سے کھل کر بات کرنی چاہئے۔ میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ ہو سکتا ہے آپ ہی کی طرح پولیس بھی کچھ دیر بعد یہاں پہنچ جائے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لہذا جلدی کیجئے۔"

"وہ میرے باپ کی ایک ایسی محبوبہ کی بیٹی تھی۔ جس سے میرے باپ کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے والدین نے اپنے کسی ایسے عزیز سے اس کی شادی کر دی تھی جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ دو تین سال بعد اس کا شوہر کسی وبا کا شکار ہو کر مر گیا۔ اس سے ایک بچی تھی... یہی شاہینہ! جب میرے باپ سے اس کی ماں نے نکاح کیا اس وقت شاہینہ کی عمر تین سال تھی، اور میں دس سال کا

تھا۔ میری ماں کا انتقال بھی میری صغر سنی ہی میں ہو گیا تھا۔ کوئی دو سال کا رہا ہوں گا۔ بہر حال شاہینہ کی ماں بھی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہی تھی۔ شاید تین سال بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر میرے باپ نے تیسری شادی نہیں کی تھی میری شادی شاہینہ سے کرتے وقت انہوں نے ایک وصیت نامہ مرتب کیا تھا جس کی رو سے اگر کبھی کسی وجہ سے میں اسے طلاق دینا چاہتا تو ساری جائداد شاہینہ کی طرف منتقل ہو جاتی۔ اگر شاہینہ خود طلاق کا مطالبہ کرتی تو طلاق ہونے کی صورت میں صرف چوتھائی حصے کی حقدار ہوتی۔ یہ ظلم کیا تھا میرے باپ نے مجھ پہ۔ بہر حال شادی مجھے کرنی پڑی تھی۔ اور اس وقت تک شاہینہ بے راہ روی کا شکار بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو بہت بعد میں اس نے ہاتھ پیر نکالے اور میرا دل اس کی طرف سے پھرنے لگا تھا۔"

وہ خاموش ہو کر دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔ انور نے بھی اپنا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگاتے وقت اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔

"اور اب یہ نئی بات معلوم ہوئی ہے کہ اس نے کوئی اپارٹمنٹ ڈائمنڈ اسکوائر میں بھی لے رکھا تھا۔" رضی سلطان نے کہہ کر ایک طویل کش لیا۔

انور خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس نے صرف سر کو جنبش دی۔

"وہ جلنسی جنون میں مبتلا تھی۔ مسٹر انور اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ بے شمار دوست رکھتی تھی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے ہو سکتا ہے اس نے وہ فلیٹ محض رنگ رلیاں منانے کے لئے لیا ہو۔"

"پڑوسیوں نے ایسی کوئی اطلاع نہیں دی۔" انور بولا۔" ان کے بیان

کے مطابق وہ وہاں پرسکون زندگی گذار رہی تھی۔ کبھی کوئی مرد اس کے فلیٹ
میں نہیں دیکھا گیا۔"

"جہنم میں جائے۔" رضی بہت برا سا منہ بنا کر بولا۔

انور نے پھر اسے غور سے دیکھا۔ رضی سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے
کو دیکھتا رہا۔

"کیا وہ دونوں خطوط آپ کے پاس موجود ہیں جو کسی نامعلوم فرد کی طرف
سے آپ کو بھیجے گئے تھے۔"

"محفوظ ہیں لیکن بے کار کیونکہ ٹائپ کئے گئے ہیں اور ان پر بھیجنے والے کا
نام بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پولیس اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتی ہے کہ ممکن ہے
میں نے ہی وہ خط اپنے نام روانہ کئے ہیں۔"

"بات سمجھ میں آنے والی ہے!" انور سر ہلا کر بولا۔ "بہرحال آپ یہ سمجھتے تھے
کہ خود مقتولہ ہی آپ سے دولاکھ اینٹھنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"میں یہی سمجھتا تھا اور سمجھنے کا جواز بھی تھا۔ صرف ایسی ہی شخصیتوں کے لئے
اتنی بڑی رقومات کی جدائی برداشت کی جا سکتی ہے جو بہت پیاری ہوں۔ دنیا
جانتی ہے کہ مجھے اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ تھی۔ لہذا کوئی ایسی احمقانہ حرکت
کیوں کرنے لگا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔" انور سر ہلا کر بولا۔ "لیکن آخر اس کا قاتل کون
ہو سکتا ہے۔"

"کوئی بھی چاہنے والا، جس نے اسے صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے

کی کوشش کی ہو اور اس میں ناکام رہا ہو۔"

انور کچھ نہ بولا۔ وہ ایسے جواز پیش کر رہا تھا کہ اس سے اتفاق کر لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ دفعتاً وہ پوچھ بیٹھا "لیکن آپ نے اس دھمکی پر کیسے یقین کر لیا کہ وہ پانچ بجے قتل کر دی جائے گی۔"

"بس اسے احتیاط کہہ لیجئے مسٹر انور۔ یقین نہیں تھا مجھے۔"

"کیا آپ نے اس واقعے کے بارے میں کسی اور کو بھی کچھ بتایا ہے؟"

"اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مسٹر انور۔"

"وہ دوسرے صاحب کون تھے آپ کے ساتھ؟"

"ایک انسٹرٹینمنٹ انسپکٹر۔"

"تو گویا وہ بھی شہادت دے گا کہ آپ نے وہ وقت میرے ساتھ گزارا تھا"

"یقیناً مسٹر انور... اور کیفے جیفری کے وہ سارے ویٹر بھی جو مجھے پہچانتے ہیں..."

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"لیکن سب سے زیادہ اہمیت آپ جیسے کسی شاہد کی ہوگی۔"

"پولیس والے مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عدلیہ انتظامیہ کے دباؤ میں نہیں ہے۔"

"پولیس کو آپ کیا بتائیں گے۔"

"یہی سب کچھ جو آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"کوئی نکتہ بھی نہ رہنے پائے۔"

"ایسا ہی ہوگا مسٹر انور۔"

"اور وہ دونوں خطوط بھی پولیس کے حوالے کر دیجئے گا۔"

"وہ تو کرنے ہی پڑیں گے۔ اگر ان کا ذکر آگیا۔"

"ان کا ذکر ضروری ہے۔"

"بہت بہتر۔"

"ایک بار پھر یادداشت پر زور دیجئے کہ وہ صرف ایک ہفتہ غائب رہی تھی اور اس سے قبل ساری راتیں گھر ہی پر گذارتی رہی تھی۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے مسٹر انور کہ اس ایک ہفتے کے علاوہ وہ کبھی رات بھر گھر سے غائب نہیں رہی۔"

"اچھا اب اجازت دیجئے۔" انور اٹھتا ہوا بولا۔ "اگر اس سلسلے میں عدالت سے طلبی ہوئی تو کوتاہی نہ کروں گا۔"

"شکریہ مسٹر انور۔ آپ کی وجہ سے بڑی ڈھارس رہے گی۔"

"ایک بات اور کیا آپ مقتولہ کے کسی ایسے دوست کی نشاندہی کر سکیں گے جس سے ماضی قریب ہی میں تعلقات ہوئے ہوں۔"

"مائی ڈیئر مسٹر انور... میں کبھی اس کی ٹوہ میں نہیں رہا... بس وہ میرے جسم پر ایک دُکھتے ہوئے اَوندھے پھوڑے کی طرح رہی ہے۔" انور اس سے مصافحہ کرکے رخصت ہو گیا۔

⁂

انسپکٹر ملک نے طویل سانس لی اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ انور محسوس

کر رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن شاید مناسب الفاظ نہیں مل رہے!
"میں سمجھ گیا انسپکٹر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" بالآخر انور ہی بولا۔
"کیا سمجھ گئے؟"
"شاید آپ شکوہ کرنا چاہتے ہیں کہ میں نے آپ کو رضی سلطان کے بارے میں موقعہ واردات پر کچھ نہیں بتایا تھا۔"
"واقعی تم بہت ذہین ہو۔" وہ سر ہلا کر بولا۔
"دراصل میں اس معاملے کو پوری طرح سمجھے بغیر کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔"
"ہوں! میرا بھی یہی خیال تھا۔ بہر حال اس نے بہت کھل کر گفتگو کی ہے۔ یہ تک بتا دیا کہ کس مقصد کے تحت اس نے تمہارا ایک گھنٹہ ضائع کرایا تھا۔"
"اگر آپ اس کا پورا بیان دہرا سکیں تو بہتر ہو گا۔" انور نے کہا۔ "میں دیکھوں گا۔ کہ مجھ سے جس قسم کی باتیں کی تھیں ان میں اختلاف تو نہیں ہے۔"
انسپکٹر ٹنک نے رضی سلطان کی کہانی شروع کر دی اور انور کی پنسل پیڈ پر چلتی رہی تھی۔
انسپکٹر کے خاموش ہونے پر بولا۔ "کوئی فرق نہیں ہے۔"
"اور وہ ٹائپ رائٹر بھی مل گیا ہے۔ جس سے دونوں خطوط ٹائپ کئے گئے تھے۔"
"کہاں سے ملا۔" انور چونک پڑا۔
"اسی فلیٹ سے جہاں وہ قتل ہوئی تھی۔"
"تو گویا وہ حرکت شاہینہ ہی کی تھی؟"
"اور پھر مطالبہ پورا نہ ہونے پر دھمکی کے مطابق ساڑھے پانچ بجے خودکشی کر لی۔"

انسپکٹر ملک مسکرا کر بولا۔

"خودکشی کی صورت میں وہ پستول جائے واردات پر ضرور ملتا جس سے خودکشی کی گئی تھی۔"

"اس سلسلے میں کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"کھوپڑی سے نکالی جانے والی گولی کے بارے میں بتائیے۔"

"زیادہ سے زیادہ ایک فٹ کے فاصلے سے چلائی گئی تھی۔ اعشاریہ دو پانچ کے پستول سے۔"

انور کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"کوئی دوسرا آدمی ضرور موجود تھا فلیٹ میں... یہ خودکشی نہیں ہے مسٹر انور۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں... فائر کرنے کے بعد وہ عقبی گیلری کے چکردار زینوں سے اتر کر فرار ہوا ہوگا... پڑوسی تو صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے... اور لاش دیکھنے کے بعد انہیں اس کا ہوش ہی نہ رہا ہوگا کہ عقبی گیلری تک جاتے۔ فرار ہونے کے لئے قاتل کو بہت وقت ملا ہوگا۔"

انسپکٹر ملک کچھ نہ بولا۔

"آپ نے رضی کے ملازمین سے بھی پوچھ گچھ کی ہو گی۔" انور نے سوال کیا۔

"ہاں... وہ بھی صرف ایک ہی ہفتے کی بات کرتے ہیں۔ اس سے قبل وہ ساری راتیں گھر ہی پر گزارتی رہی تھی۔"

"لیکن پھر چھ ماہ فلیٹ میں کس نے راتیں گذاری تھیں۔"

"یہی تو سوال ہے؟"

"کیوں نہ ہم پھر ڈائمنڈ اسکوائر کی طرف چلیں "۔

"چلو"۔" انسپکٹر ملک نے کہا۔

نور پولیس کار ہی میں بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ ڈائمنڈ اسکوائر پہنچے تھے فلیٹ پولیس ہی کی تحویل میں تھا۔

"ایک بار پھر... اس فلیٹ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو کیا حرج ہے "۔ انور نے کہا۔

"ضرور... ضرور..."

انور فلیٹ کا ایک ایک گوشہ دیکھتا پھر رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے "۔ انسپکٹر ملک نے کہا" اپنے کسی عاشق کے ساتھ مل کر اس نے یہ سازش کی ہو۔ اور وہ کوئی ایسا ہی عاشق رہا ہو جو اُس کے ہرجائی پن سے تنگ آ گیا ہو۔ پھر اسی نے اسے مار ڈالا۔ اس توقع پر کہ الزام رضی کے سر آئے گا۔ اب یہی دیکھو نا کیا وہ کسی اجنبی کو اتنے قریب آنے دیتی۔ کہ وہ ایک فٹ کے فاصلے سے اس پر فائر کر سکتا۔ اُس سے پہلے ہی چیخنا شروع کر دیتی... تمہیں یاد ہو گا کہ پڑوسیوں نے فائر کے بعد چیخیں سنی تھیں۔ پہلے نہیں "۔

"میں کسی عورت کے امکان پر غور کر رہا ہوں "۔ انور نے پر تفکر لہجے میں کہا۔

"یعنی کہ قاتلہ!"

"جی ہاں! اعشاریہ دو پانچ کے پستول عموماً عورتیں ہی رکھتی ہیں۔ اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ پڑوسیوں نے مسلسل چھ ماہ سے اس کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ خصوصیت سے راتوں کا حوالہ دیا تھا۔ یعنی وہ راتیں فلیٹ ہی میں

گزارتی رہی تھی۔ رضی اور اس کے ملازمین اس سلسلے میں جھوٹ بول سکتے ہیں لیکن یہاں
کے پڑوسیوں کو کیا پڑی ہے کہ جھوٹا بیان دیں گے۔"
"یہ بھی ٹھیک ہے؟"
"اس چھ ماہ کے عرصے میں ہر رات یہ فلیٹ آباد رہا ہے اور شاہینہ کے ساتھ
کبھی کوئی مرد یہاں نہیں دیکھا گیا"
"کسی عورت کے بارے میں تو ہم نے پوچھا ہی نہیں" ملک نے کہا "کیا تم
نے ایسا کوئی سوال کیا تھا پڑوسیوں سے"
"نہیں اتفاق سے میں نے بھی نہیں پوچھا"
"آہا... ایک منٹ..." ملک ہاتھ اٹھا کر بولا "اگر عورت ہی کے امکان پر غور
رہے ہو تو وہ اس کے کسی عاشق کی جھلائی ہوئی بیوی بھی ہو سکتی ہے۔ رتاک میں رہی ہو اور
گر گئی"
"ایک منٹ کے فاصلے سے...؟" انور نے سوال کیا۔
"ہو سکتا ہے اس نے پہلے شاہینہ سے تعلقات استوار کئے ہوں پھر اس کے
ساتھ ہی فلیٹ میں داخل ہوئی ہو"
"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے ہمیں اس نئے پہلو سے پوچھ گچھ کرنی چاہئے"
نے کہا۔
پھر اس نے دوبارہ پڑوسیوں سے پوچھ گچھ شروع کی تھی لیکن کوئی بھی
کے ساتھ نہ کہہ سکا کہ اس نے کسی عورت کو وہاں آتے جاتے دیکھا ہو۔ صرف
ہی فلیٹ میں دیکھی جاتی تھی۔ اور پھر کسی کی خصوصی توجہ بھی نہیں تھی اس

طرف۔ وہ خود ہی کبھی کبھی کسی پڑوسی سے گفتگو کر لیتی تھی۔

بہرحال نئے سرے سے چھان بین کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا... لیکن کیس کے سلسلے میں زاویۂ نظر ضرور بدل گیا تھا... یعنی وہ قاتل نہیں تھا، بلکہ قاتلہ تھی۔

٭

"قاتلہ!" وہ رشیدہ کو گھورتا ہوا غرایا۔

"مت بکواس کرو۔ ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لئے خراب ہو چکے ہیں۔"

"اس کے باوجود بھی تمہیں ایسی کسی عورت کا پتہ لگانا ہے جو شاہینہ کو قتل کر دینے کا جواز رکھتی ہو۔"

"اس سے پہلے میں تمہیں ہی کیوں نہ قتل کر دوں۔" وہ دانت پیس کر بولی

"ساڑھے بائیس روپوں کے لئے؟" انور نے پوچھا۔

"کیسے ساڑھے بائیس روپے۔"

"وہی جو میں نے ابھی تک ادا نہیں کئے۔"

"مجھے یاد نہیں۔"

"اب تم مجھے شوق سے قتل کر سکتی ہو۔" انور اس طرح آنکھیں بند کر کے بولا جیسے رشیدہ کے ہاتھوں قتل ہو جانے کے تصور سے لذت اندوز ہو رہا ہو۔

"تم جھگڑے کی وجہ سے میری توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"مجھے یاد ہی نہیں جھگڑے کی وجہ۔"

"تمہارے کہے بغیر تمہارے لئے سگریٹ لائی تھی اور تم نے مجھے جھڑک دیا تھا۔"

"واقعی بہت برا کیا تھا میں نے سخت نالائق واقع ہوا ہوں۔"

"تمہاری شکل دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"شکل دیکھے بغیر بھی میرے کام آسکتی ہو۔"

"میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جو شاہینہ کو قتل کر سکتی ہے"۔

"آنکھیں بند کر کے بتادو۔ تمہارے الفاظ میرے کانوں تک پہنچ جائیں گے اور میری شکل بھی تمہیں نظر نہیں آئے گی۔"

"نہیں بتاؤں گی۔"

"رشیدہ کی بچی۔"

"بدتمیزی نہیں۔"

"جہنم میں جاؤ۔" انور اٹھتا ہوا بولا۔ وہ خود ہی اس کے فلیٹ میں آیا تھا۔ رشیدہ نے تو کئی دن سے اس کے فلیٹ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ دروازے کے قریب جاکر مڑا اور بولا "میں بھی ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جس سے شاہینہ کی قاتلہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کر لوں گا۔"

"بیگم ریاض۔" رشیدہ بولی

"تم سے زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ بھی ہے۔"

"اگر تم نے اس کی طرف رخ بھی کیا تو گولی ماردوں گی۔" رشیدہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

"کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا۔"

"ایسے نہیں تمہیں گولی ماردوں گی۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" انور دروازے کی طرف مڑتا ہوا بولا۔

"ٹھہرو! وہ تمہیں اس عورت کے بارے میں نہیں بتا سکے گی۔ کیونکہ وہ

اس کے حلقے کی عورت نہیں ہے"۔

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں اپنے قدموں پر گرا کر کہوں؟"

"جس عورت کی بات میں کر رہی ہوں وہ تم سے بھی بات نہیں کرے گی"۔

"تم سے کرے گی"۔

"ہاں۔ میں اُسے زبان کھولنے پہ مجبور کر سکتی ہوں"۔

"لیکن میرا تم سے جھگڑا ہو چکا ہے"۔

"اگر تم معافی مانگ لو تو"۔

انور آگے بڑھتا چلا گیا لیکن رشیدہ نے پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ پیچھے پہنچ کر اسکوٹر اسٹارٹ ہی کر رہا تھا کہ رشیدہ پیچھے بیٹھ گئی۔ انور ایسا بنا رہا جیسے خبر ہی نہ ہوئی ہو۔ اسکوٹر حرکت میں آیا تھا اور رشیدہ بول تھی "موڈل ٹاؤن"۔

کچھ دیر بعد اس نے کہا "موڈل ٹاؤن کے کیفے روزینہ کی طرف"۔

"کیا وہ عورت وہیں ملے گی"۔

"نہیں... پہلے کچھ ضروری باتیں"۔

انور کچھ نہ بولا۔ اور پھر اُس نے اسکوٹر اسی کیفے کے قریب روکا تھا۔ دونوں اندر آئے اور ایک میز منتخب کر کے بیٹھ گئے۔

"ہوں! کیا بات ہے" انور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"پہلے کافی۔ یہاں بیٹھنے کا جواز تو ہونا ہی چاہیئے"۔

"جواز کے لئے میری جیب خالی ہے"۔

"خدا کے ننگے بھوکے ہو کوئی نئی بات نہیں" رشیدہ نے کہا اور اشارے

سے ویٹر کو بلا کر آرڈر پلیس کرنے لگی۔ اس کے چلے جانے پر انور سے بولی۔" آج سے آٹھ ماہ قبل ایک میرین انجینیئر کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو اس حادثے کا سبب معلوم ہے"۔

"کس میرین انجینیئر کی بات کر رہی ہو؟"

"باسط رشید نام تھا۔ خوبصورت تندرست اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ شاہینہ کے چکر میں پڑ گیا۔ کچھ دن تک اس نے اس میں دلچسپی لی تھی پھر اکتا گئی تھی۔ ایک رات کلب میں شاہینہ نے اسے خوب پلا دی۔ اور کچھ اس قسم کی باتیں کیں کہ وہ تاؤ میں آ کر بولا کہ وہ اس حالت میں بھی کار ڈرائیو کر سکتا ہے۔ شاہینہ نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ صبح کو اسے مختلف تھانوں کی حوالات میں تلاش کرے گی۔ اس پر باسط نے پولیس والوں کو گالیاں دی تھیں اور اپنی کار پارکنگ پلاٹ سے نکال لایا تھا۔ دو تین لوگ اور بھی وہاں موجود تھے انہوں نے بھی اسے کار ڈرائیونگ سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مانا تھا اور پھر ایک ہی گھنٹے بعد کلب میں خبر پہنچی تھی کہ وہ حادثے کا شکار ہو کر جائے حادثہ پر ہی ختم ہو گیا۔ اس کی بیوی شہرزاد تقریباً ایک ماہ تک پاگل رہی تھی اور اس عالم میں اس کی زبان سے صرف ایک ہی جملہ نکلتا تھا"۔ میں شاہینہ کو مار ڈالوں گی"۔ اب وہ نارمل ہے لیکن بہت زیادہ پراسرار نظر آنے لگی ہے"۔

انور خاموشی سے سنتا رہا۔ بات ختم ہونے پر بولا۔" باسط رشید یقیناً حادثے کا شکار ہوا تھا لیکن یہ کہانی میرے لئے بالکل نئی ہے۔ تم نے کس سے سنی تھی؟"

"شہرزاد کی ایک قریبی دوست سے!"

ویٹر کافی لے آیا تھا۔ انور تھوڑی دیر بعد بولا۔ "اگر فرض کر لیا جائے کہ شہرزاد کو بالآخر اسے قتل کر دینے کا موقعہ مل گیا تو قتل ٹھیک اسی وقت کیوں ہوا جس کا حوالہ رضی کو ملنے والے خط میں موجود تھا۔ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ شاہینہ اور شہرزاد اس قدر قریب آگئی ہوں کہ مل کر سازش کر سکتیں۔"

"کیسی سازش؟"

"رضی سے بدلا کھ اینٹھنے کی سازش!"

"اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی میں نے تو آج تک شہرزاد کو دیکھا ہی نہیں اس کی ایک سہیلی سے اس کی کہانی سنی تھی۔"

"اس کیس میں بنیادی نکتہ، موت کے وقت کا تعین ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہ خود اس سازش میں شریک نہ رہی ہو لیکن کسی طرح اسے علم ہو گیا ہو کہ شاہینہ اپنے شوہر کو اس قسم کے خطوط بھیج رہی ہے۔ بس پھر اس نے موقع سے فائدہ اٹھالیا۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔" انور سر ہلا کر بولا۔

وہ کافی پی چکے تھے۔ رشیدہ نے بل کی رقم کی ادائیگی کی اور پانچ یا چھ منٹ بعد وہ اس عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس کے ایک فلیٹ میں شہرزاد رہتی تھی۔

"اس سے ذاتی طور پر نہ تم واقف ہو اور نہ میں۔" رشیدہ نے کہا۔ "پھر کیا صورت ہوگی۔"

"فکر نہ کرو۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ تم نے اس کی کہانی سنا دی ہے۔ چلو۔"

پھر وہ اس کے فلیٹ کے سامنے جا رکے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر ہی رہتی تھی

انور نے آگے بڑھ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔

خاصی دیر بعد اندر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ دو وحشت زدہ سی آنکھیں انہیں گھور رہی تھیں۔

"محترمہ شہر زاد!" انور نے بڑے ادب سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" پوچھا گیا۔

"کیا آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں گی؟"

"کس لئے؟"

"ہمیں رضیہ قمر علی نے بھیجا ہے۔" رشیدہ جلدی سے بولی۔

"اوہ... اچھا... ایک منٹ انتظار کیجیے۔" اس نے کہا اور دروازہ بند کر کے واپس چلی گئی۔

انور نے پُر معنی انداز میں رشیدہ کی طرف دیکھا۔ اس نے کاندھے اچکا دیئے لیکن انور کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ جلد ہی شہر زاد واپس آئی دروازہ کھول کر اندر آنے کی دعوت دی۔

دلآویز خدوخال اور متناسب جسم والی جواں سال عورت تھی۔ البتہ آنکھوں میں عجیب سی بے چینی کا عالم نظر آ رہا تھا۔

وہ انہیں سٹنگ روم میں لائی اور بیٹھنے کو کہا پھر ہمہ تن سوال بن کر انہیں دیکھنے لگی۔

"تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں محترمہ! میرا نام انور ہے اور اسٹار کا کرائم رپورٹر ہوں۔"

شہزاد کی آنکھوں سے جھانکنے والی بے چینی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اور وہ غیر ارادی طور پر مڑ کر اپنے عقب میں دیکھنے لگی۔ پھر مضطربانہ انداز میں ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

" دراصل میں پچھلے سال کے ٹریفک حادثات کی ایک رپورٹ مرتب کر رہا ہوں " انور نے کہا۔

" اچھا۔ اچھا! وہ سر ہلا کر بولی " لیکن مجھے افسوس ہے کہ ماضی کو نہیں کریدنا چاہتی! آپ میرے شوہر والے حادثے سے متعلق بات چیت کریں گے "۔

" جی ہاں! "

" میں معافی چاہتی ہوں " اس نے پھر مڑ کر دیکھا۔

" ایک مسئلہ اور بھی ہے "

" میں معافی چاہتی ہوں "

رشیدہ کی نظریں اس دروازے پر جم کر رہ گئیں جس کی طرف شہزاد نے دو بار عجیب سے انداز میں دیکھا تھا۔

" صرف ایک بات محترمہ... کیا یہ صحیح ہے کہ شاہینہ سلطان نے انہیں نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کی ترغیب دی تھی "۔

" مم... میں نہیں... سمجھ سکتی کہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں! " وہ ہکلائی۔

" شاہینہ سلطان کی بات کر رہا ہوں "

" ک... کون شاہینہ سلطان ؟ "

اچانک رشیدہ نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے ساتھ لیتی ہوئی فرش پر چلی

آئی۔ شہزاد کی چیخ نکل گئی۔ سامنے والے شوکیس پر رکھا ہوا بڑا گلدان چور چور ہوگیا
شیشوں کی جھنجھناہٹ سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ انور دروازے کی طرف جھپٹا لیکن
وہ دوسری طرف سے بند تھا۔ پھر اس نے باہر کی جانب دوڑ لگائی۔ گھوم کر
عمارت کی پشت پر پہنچا۔ فلیٹ کا عقبی دروازہ کھلا ہوا دکھائی دیا۔ باہر دور دور
تک کسی کا پتہ نہیں تھا وہ عقبی دروازے سے فلیٹ میں دوبارہ داخل ہوا اور اس
کمرے تک جا پہنچا جس کا دروازہ اس نے سٹنگ روم کی طرف سے کھولنے کی
کوشش کی تھی۔

بولٹ گرا کر دروازہ کھولا اور پھر سٹنگ روم میں داخل ہوا۔ یہاں شہزاد
رشیدہ سے الجھی ہوئی تھی۔

"محترمہ!" انور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آپ پر بے آواز پستول سے فائر کیا گیا تھا۔
اگر یہ بروقت قدم نہ اٹھاتیں تو گلدان کی بجائے آپ کا سر نشانہ بنا ہوتا۔"

"نہیں!" وہ ہذیانی انداز میں چیخی تھی۔"

انور نے جلد ہی گولی تلاش کر لی اور اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "میں غلط
نہیں کہہ رہا۔"

شہزاد کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ اور پھر وہ چکرا کر گر پڑی اور بے حس
وحرکت ہوگئی۔

٭

ہائی سرکل نائٹ کلب میں فلور شو ہو رہا تھا۔ ایک سفید فام رقاصہ
میزوں کے درمیان تھرکتی پھر رہی تھی۔ انور ہال میں داخل ہوا اور اس میز کی

طرف بڑھتا چلا گیا جو رضی سلطان کے لئے مخصوص تھی۔
"اوہو! مسٹر انور! تشریف رکھئے" رضی سلطان چہک کر بولا۔
"آپ نے مجھے بڑی دشواری میں ڈال دیا ہے رضی صاحب"۔
"کیوں؟ کیا کوئی خاص بات ہے!"
"نہ جانے کتنی باتیں نکل آئی ہیں۔ محکمہ سراغ رسانی کا خیال ہے کہ آپ نے مجھے اس انٹرٹینمنٹ انسپکٹر اور کیفے جیفری کے ہیڈ ویٹر کو خاصی بڑی رقومات رشوت کے طور پر دی ہیں"۔
"آپ خواہ مخواہ پریشان ہیں مسٹر انور! عدالت میں نپٹ لیا جائے گا محکمہ سراغ رسانی سے بھی"۔
اچانک کسی جانب سے انسپکٹر ملک نمودار ہوا اور سیدھا اسی میز کی طرف چلا آیا۔
"اچھا تو آپ یہاں تشریف فرما ہیں! مجھے آپ ہی کی تلاش تھی"۔ اس نے انور سے کہا۔
"فرمایئے! میرے لائق کوئی خدمت"۔
"چار سے چھ بجے تک کہاں تھے؟"
"مارا مارا پھر رہا تھا۔ رپورٹروں کو ٹک کر بیٹھنا کب نصیب ہوتا ہے ملک صاحب!"
"کیا یہ غلط ہے کہ تم چار بجے ماڈل ٹاؤن میں تھے..."
"تو تم اس سے واقف ہو کہ وہاں چار اور چھ کے درمیان ایک عورت

قتل کر دی گئی ہے۔"

"خدا کی پناہ قتل ..." رضی سلطان طویل سانس لے کر بولا۔ "حضرات! اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں سے ہٹ جاؤں۔ بس ہر طرف قتل.. قتل!"

"نہیں رضی صاحب! آپ تشریف رکھیے۔" انور جلدی سے بولا۔ "ایسی افواہوں پر کان نہ دھرا کیجیے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر انور کو گھورنے لگا۔

"انسپکٹر ملک کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے قتل ہو جاتا لیکن میری وجہ سے نہیں ہو سکا۔ وہ عورت زندہ ہے مطمئن رہئے۔"

"میں کیوں مطمئن رہوں... کون عورت، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"آپ کی محبوبہ رضی صاحب! میں شہزاد کی بات کر رہا ہوں۔"

"مسٹر انور... میں کسی احمقانہ بے تکلفی کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"میں کہتا ہوں رضی صاحب آپ کو کس گدھے نے مشورہ دیا تھا کہ مجھے اپنا شاہد بنانے کی کوشش کریں۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہوں رضی صاحب! اس لئے کوئی پتھر الٹے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مناسب یہی ہوگا کہ آپ ہتھکڑیوں کے لئے اپنے ہاتھ انسپکٹر ملک کی طرف بڑھا دیں۔"

"کیا بکواس ہے!" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو!" ملک غرایا۔ ساتھ ہی اس کا ریوالور بھی نکل آیا۔

"تم لوگوں کو پچھتانا پڑے گا" رضی تھکی تھکی سی آواز میں بولا اور بیٹھ کر ہاتھ ملنے لگا۔

"وہ زندہ ہے اور پوری کہانی سنا چکی ہے، مسٹر رضی!"

"سب کچھ جھوٹ ہے! وہ شاہینہ کو قتل کر دینے کے بعد مجھ سے ملی تھی۔ بہت عرصہ سے میرے پیچھے تھی مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ کسی نہ کسی طرح شاہینہ کے قتل میں مجھے ملوث کرا دے گی"۔

"یہ جھوٹا ہے!" قریب ہی سے ایک نسوانی آواز آئی اور رضی اچھل پڑا۔ بائیں جانب رشیدہ شہزاد کو سہارا دیئے کھڑی تھی۔ رضی سلطان نے اچانک میز الٹ دی اور اچھل کر بھاگا۔ رقاصہ سے ٹکرایا وہ چیخی اور رضی دوسری میز پر ڈھیر ہو گیا۔

☆

انور اخبار کے لئے اپنی رپورٹ کے اختتامی مرحلے پر لکھ رہا تھا

..."باسط رشید کی حادثاتی موت کے بعد رضی سلطان اس کی بیوہ شہزاد سے مل بیٹھا تھا۔ اس اعتبار سے دونوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی کہ دونوں ہی شاہینہ سے نفرت کرتے تھے خصوصیت سے شہزاد کی نفرت ایسی ہی تھی کہ وہ اسے قتل بھی کر سکتی تھی۔ کئی بار اس نے اپنا یہ خیال رضی سلطان پر بھی ظاہر کیا تھا۔ رضی نے ایک اسکیم مرتب کر ڈالی۔ اس کی بیوی شاہینہ جنسی کمزوری کا شکار تھی۔ اس کی راتیں تو گھر ہی پر گزرتی

تھیں لیکن دن بھر سوشل ورک کے بہانے گھر سے غائب رہتی تھی لیکن یہ وقت عیاشیوں میں گزرتا۔ اس کے لئے وہ شہر کے دوسرے حصوں میں مکانات کرائے پہ حاصل کرتی تھی اور اس طرح کی قیام گاہیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بدلتی رہتی تھی۔ آخری قیام گاہ ڈائمنڈ اسکوائر میں تھی جہاں وہ قتل کر دی گئی۔ رضی مستقل طور پہ اس کی ٹوہ میں رہتا تھا اور اسے ہمیشہ علم رہتا تھا کہ وہ کب کہاں ہوتی ہے۔ ادھر وہ شہرزاد سے اس طرح ملتا تھا کہ کسی کو ان کے تعلقات کا علم نہ ہو سکے کیونکہ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ شاہینہ کو شہرزاد سے ہی قتل کرائے گا۔ لہذا اس نے ڈائمنڈ اسکوائر والے فلیٹ کے قفل کی دوسری کنجی بنوائی اور شہرزاد کے حوالے کر دی۔ شہرزاد قد اور جسامت میں شاہینہ کے مماثل تھی۔ شاہینہ رات گھر پہ گزارتی تھی اور شہرزاد اپنی راتیں اس کے فلیٹ میں گزارتی تھی۔ مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ وہاں شاہینہ کو قتل کر دینے کے بعد فرار ہو جانے کی مشق کرے۔ . . پھر اچانک اسی زمانے میں شاہینہ کو اپنے شوہر سے بڑی رقم اینٹھنے کی سوجھی اور اس نے اپنے اغوا اور رقم کے مطالبے کا ڈرامہ کر ڈالا۔ رضی اس کے اس پلاٹ سے بخوبی واقف تھا لہذا اسے وہی موقعہ مناسب معلوم ہوا۔

قتل والے دن اسکیم کے مطابق شہرزاد اس کے فلیٹ میں دن ہی کو داخل ہوئی تھی اور کہیں چھپ گئی تھی۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے

اس نے اسے قتل کر دیا۔ اور عقبی زینوں سے اتر کر فرار ہو گئی۔ چونکہ عرصے سے اسی کی مشق بہم پہنچاتی رہی تھی اس لئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ ادھر رضی سلطان مطمئن تھا کہ خصوصیت سے کسی کی توجہ شہزاد کی طرف منعطف نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ وہ دوسروں کے علم میں اُس سے کبھی نہیں ملا تھا۔

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ جب میں شہزاد سے ملنے پہنچا تو وہ اس کے فلیٹ میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چھپ گیا۔ میں اس سے قطعی لاعلم تھا اور پھر جب اس نے یہ محسوس کیا کہ شائد مجھے اصل واقعے کی سن گن مل گئی ہے تو اس نے سائیلنسر لگے ہوئے پستول سے شہزاد کو بھی ٹھکانے لگا دینے کی کوشش کر ڈالی۔ پھر شہزاد پر ہسٹریا قسم کا دورہ پڑا اور اس نے اعصابی دباؤ کے تحت سب کچھ اگل دیا تھا۔

رضی سلطان ہر وقت مسلح رہتا تھا۔ گرفتاری کے وقت بھی اس کے پاس وہی پستول سائیلنسر سمیت موجود تھا۔ جس سے اس نے شہزاد پر فائر کیا تھا۔

سُوّر کا بچّہ محبوب

لڑکا کچھ بیزار بیزار سا نظر آرہا تھا لیکن لڑکی بے حد رومینٹک ہو رہی تھی اور کیوں نہ ہوتی، بڑی خوبصورت شام تھی اور سمندر کا کنارا تھا۔

لڑکے پہ اس لئے بیزاری مسلط تھی کہ وہ یہاں تفریحاً نہیں آیا تھا اُس کے باپ کی ماہی گیری کی کشتیاں تھیں جن کی دیکھ بھال اُس کی ذمہ داریوں میں شامل تھی۔ یونیورسٹی میں بی ایس سی کا طالب علم تھا اور لڑکی سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔۔ ہم جماعت تھی اُس کی۔

جب لڑکی کو معلوم ہوا کہ وہ بھی ساحل ہی کے قریب والی بستی میں رہتا ہے تو اُسے اُس سے محبت ہوگئی۔ کیونکہ وہ خود بھی وہیں رہتی تھی اور لڑکے کو اس مشہور کہاوت پہ یقین آگیا تھا کہ عورت ایک ایسی بیل ہے جو قریب کے درخت پہ چڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ تو سکتا نہیں تھا۔ لڑکی کی محبت اُسے بہر حال برداشت کرنی پڑی تھی۔۔ لڑکا ذرا فلسفی قسم کا تھا! اور لڑکی بے حد رومینٹک۔۔ فلموں میں ناکام محبت قسم کی ہیروئنوں کی اداکاری اُسے ہچکیوں سے رونے پہ مجبور کر دیتی تھی! ہر وقت اپنے ذہن پہ غم آلودسی اُداسی مُسلّط رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

اس وقت وہ اُسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی ۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کہاں سے نازل ہوگئی ۔ کشتیوں کی واپسی کا حساب کتاب کرکے جانے ہی والا تھا کہ وہ ٹپک پڑی ۔

"ہائے کیسی نرم اور خُنک ہوا ہے!" وہ سسکاری لے کر بولی۔

لڑکے کے نتھنے پھڑکے اور وہ ایک عدد چھینک مار کر بولا "نزلہ پیدا کرتی ہے ایسی ہوا"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوتا" لڑکی اِٹھلائی۔

"لہسن کی چٹنی کھاتی ہو گی"

"چھی ۔۔ لہسن کی چٹنی ۔۔! مجھے تو نفرت ہے لہسن کی بُو سے!"

"تو پھر کوئی اور وجہ ہو گی" لڑکا بیزاری سے بولا۔

"اوہ ... ! وہ ادھر دیکھو اُس چٹان کے اُدھر وہ جو سفید پرندہ بیٹھا ہوا ہے"

"بگلا ہے!"

"کیا محسوس ہو رہا ہے ... !"

"بھلا میں بگلے کے احساسات کی ترجمانی کس طرح کر سکوں گا"

"تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے ... !"

"مجھے ... !" لڑکے نے حیرت سے کہا۔ "مجھے کیا محسوس ہو گا ... !"

"ہائے اُس کے شفاف پروں کی نرمی مجھے اپنے گالوں پر محسوس ہو رہی ہے"

لڑکے نے اُسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور منہ چلا کر رہ گیا۔

"سفید پرندے!" وہ آنکھیں بند کر کے بولی "جب سفید پرندے شام کی دھند لاہٹوں میں پرواز کرتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے کانوں میں آہستہ آہستہ کہہ رہا ہو۔ اُڑو... تم بھی اُڑو... اُڑو... اُڑتی رہو حتّیٰ کہ تھک کر گر پڑو۔"

"کانوں میں کوئی کہتا ہے!" لڑکے نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں!" وہ نیم وا آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"خدا کے لئے چھاپک شاہ کے مزار پہ حاضری دو... آسیب جل جائے ورنہ ہو سکتا ہے کہ زندگی بھر پریشان رہو۔"

"کیا بک رہے ہو!"

"یقین کرو۔ میرے ایک ماہی گیر کی بیوی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ کوئی اُس کے کانوں میں کہتا تھا کنوئیں میں کود پڑو... اور وہ ایک دن سچ مچ کود گئی۔"

"بڑے بھولے ہو تم۔!" وہ ہنس پڑی۔ ہنستی رہی اور پھر بولی "اسی لئے تو تم پہ اتنا پیار آتا ہے۔"

"میں تمہارے پاپا سے کہوں گا۔"

"کیا کہو گے؟"

"یہی کہ تمہیں چھاپک شاہ کے مزار پہ لے جائیں۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔"

"کیا نہیں سمجھتا۔!"

"یعنی ... کہ تمہیں کبھی فطرت کی سرگوشیاں نہیں سنائی دیتیں۔"

"ارے وہ پھوہڑ... فطرت... !"

"کیا مطلب؟"

"میری خالہ کی لڑکی ہے ... گندی، بدسلیقہ، بدزبان۔"

"یہاں اُس کا کیا ذکر ــــ"

"تم فطرت ہی کی بات تو کر رہی تھیں ... میں تو کبھی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا بھی نہیں اُس کی طرف۔"

"اف فوہ ــــ! میں تمہاری خالہ زاد فطرت کی بات نہیں کر رہی تھی ــــ نیچر ــــ نیچر کی سرگوشیوں کی بات تھی۔ ..."

"ارے لاحول ... !" وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

وہ بھی بُرا سا مُنہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔

"اب چلیں؟" لڑکے نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"نہیں، میں غروب کا منظر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"پرسوں بھی تو دیکھ چکی ہو۔"

"روز نئی بات ہوتی ہے، نئے احساسات ہوتے ہیں۔ کبھی شفق سرخ ہوتی ہے اور کبھی اس میں نیلگوں دھاریاں بھی شامل ہوتی ہیں۔"

"وہ تو ہوتی ہی ہیں" بڈھے نے مری مری سی آواز میں کہا۔

"تم کیا محسوس کرتے ہو؟"

"بس یہی کہ اب رات ٹوٹ چکے گی اور دن بھر کی تھکن سے نجات ملے گی"

"ہائے رے سادگی!"

"پھر اور کیا محسوس کرنا چاہیئے؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرا وجود بھی ان رنگین دھندلکوں میں تحلیل ہو جائے گا"

لڑکے کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ لڑکی نے اُسے غور سے دیکھا اور بولی۔ "یہ کیا بڑبڑا رہے ہو۔"

"آیت الکرسی پڑھ رہا ہوں"

"کیوں ...؟"

"آسیب ہی معلوم ہوتا ہے!"

لڑکی زور سے ہنسی تھی اور لڑکا ہونقوں کی طرح اُس کی شکل دیکھنے لگا تھا

"تمہاری معصومیت پر کبھی پیار آتا ہے ... اور کبھی غصہ!"

"مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا ... ویسے تمہاری باتیں عجیب ہوتی ہیں"

"کیا تمہیں اچھی نہیں لگتیں"

"اچھی تو لگتی ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتیں"

"اس کے باوجود بھی میں یہ چاہتی ہوں کہ تم ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہو"

"تم سے جدائی کا تصور بھی میرے لئے موت سے کم نہیں"۔
لڑکا ٹھنڈی سانس لے کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔
"کیا دیکھ رہے ہو"۔
"آخر بارش کب ہوگی۔ دن بھر حبس رہتا ہے"۔
"ہو جائے گی" لڑکی بُرا سا منہ بنا کر بولی۔
"اس بار بڑے جھینگے نہیں مل رہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے"۔ لڑکے نے کہا
"بدبودار باتیں مت کرو"۔
"کیا تمہیں جھینگے پسند نہیں ہیں"۔
"صرف تلے ہوئے۔ وہ بھی جو چائنیز ریستورانوں میں ملتے ہیں"۔
"جھینگوں کا پلاؤ کھایا ہے کبھی"۔
"نہیں"۔
"بے حد لذیذ ہوتا ہے! امی تو شاندار پکاتی ہیں۔ کہو تو کبھی کھلاؤں"۔
"تمہاری امی بہت سوئیٹ ہیں"۔
"پاپا کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ کہتے ہیں کہ اُن سے زیادہ کڑوی کسیلی عورت اُن کی نظروں سے کبھی نہیں گزری"۔
"شوہر بیوقوف ہوتے ہیں۔ انہیں تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی"۔
"تمہارے ڈیڈی تمہاری ممی کے شوہر ہیں"۔
"ہوں گے۔ میں کیا جانوں!"
"تمہارا بھی کوئی ہوگا"۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ ضروری نہیں کہ شادی بھی کر لوں۔"

"تو پھر کیا فائدہ؟" لڑکے نے مایوسی سے کہا۔

"میں عورت ہوں بنئے کی دوکان نہیں کہ تم فائدہ اور نقصان لے بیٹھو"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے۔"

"کرتی رہو... محبت۔"

"مرتے دم تک کروں گی۔"

"یعنی... میں کراچی میں رہوں گا۔ اور تم لاہور میں بیٹھ کر مجھ سے محبت کرو گی۔"

"کیوں نہیں۔"

"اور میں یہاں کیا کروں گا؟"

"جو تمہارا دل چاہے۔ لیکن میرے علاوہ اور کسی سے محبت کی تو گولی مار دوں گی... ہائے وہ دیکھو... پانی پہ وہ رنگین لہریئے کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔"

"لگ تو رہے ہیں... لیکن... یہ محبت..."

"کیوں کیا ہوا ہے اس محبت کو!"

"میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"کیوں نہیں آتی۔ آنی چاہیئے۔ یہ تو روحوں کا رشتہ ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔"

"آجائے گی۔ جلدی کیا ہے۔"

"بی ایس سی کر کے تم لاہور چلی جاؤ گی۔"

"اور تمہیں چاہتی رہوں گی۔"

"خواہ کچھ ہو..."

"خواہ کچھ ہو... لیکن شادی نہ تم سے کروں گی اور نہ کسی اور سے۔"

"لیکن میرا کیا ہوگا؟"

"تم بھی یہی کرنا۔"

"لیکن... یعنی کہ نہ تم سے شادی نہ کسی اور سے..."

"اگر تم ایسا کر سکو تو فخر سے میرا سر ہمیشہ اونچا رہے گا۔"

"لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے برگشتہ ہو کر کسی اور کو چاہنے لگو۔"

"قیامت تک ممکن نہ ہوگا۔"

"اب تو میں بھی کچھ کچھ محسوس کر رہا ہوں۔"

"کیا محسوس کر رہے ہو۔"

"جیسے ہم دونوں محض روحیں ہوں۔ صدیوں سے بھٹکتی ہوئی روحیں"

"ہائے تم ایسی باتیں بھی کر سکتے ہو۔"

"اور تم ایک ایسی مدھر تان ہو جو میری رگوں میں لہو بن کر تیرتی رہتی ہے۔"

"ہائے... سویٹ... سویٹ... سویٹ۔"

"لیکن تم نے یہ کہہ کر مجھے اُداس کر دیا ہے کہ مجھ سے شادی نہیں کرو گی"
"ہم زندگی بھر شادی کے بغیر بھی ساتھ رہ سکتے ہیں"۔
"وہ کس طرح"۔
"دونوں کسی بزنس میں پارٹنر شپ کر لیں گے"۔
"انوکھا خیال ہے"۔
"چھوڑو یہ باتیں ۔ اس وقت تو سمندر کی سیر کو دل چاہ رہا ہے"۔
"آہا تو چلو ۔ ہماری ایک موٹر بوٹ ساحل ہی پہ موجود ہے"۔
"تم چلاؤ گے"۔
"ایکسپرٹ ہوں ... بارہ سال کی عمر سے تنہا سمندر میں گھستا رہا ہوں"
"تو پھر چلو ۔ ہم ان لمحات کو امر بنا لیں"۔
وہ اُس جگہ پہنچے تھے جہاں موٹر بوٹ لنگر انداز تھی ۔ لڑکے نے لنگر اُٹھا کر انجن سٹارٹ کیا اور موٹر بوٹ جھاگ اڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی ۔
"ہم دونوں ... ہم دونوں ... اس لا محدود بیکراں سمندر میں ... ہم دونوں ... صرف ہم دونوں .. " لڑکی گنگناتی رہی ۔
"مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتیں" لڑکے نے سوال کیا ۔
"ہرگز نہیں کسی کو بھی نہیں ۔ تم میری زندگی پہ محیط ہو کر رہ گئے ہو"۔
"اور مجھے ہمیشہ چاہتی رہو گی ۔ خواہ کچھ ہو"۔
"خواہ کچھ ہو میرے محبوب"۔
"یہ تو دادا جان کا نام تھا"۔

"اُدہ ... رُبش ... محبوب یعنی جس سے محبت کی جائے ... ویسے تمہارے
دادا جان کیا کرتے تھے؟"
"فوجی تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔"
"تمہارے باپ فوج میں کیوں نہ گئے؟"
"سنا ہے کہ انہیں بھی کسی سے محبت ہوگئی تھی اور وہ شاعری کرنے لگے تھے۔"
"آہا تو تمہاری ممی ..."
"نہیں۔ جس سے محبت کی تھی اُس سے شادی نہیں ہوسکی تھی ..."
"چارمنگ!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔
"مجھے تو کبھی کبھی اس پہ افسوس ہوتا ہے ... وہ آج بھی اپنی محبوبہ کو یاد کرکے
رو دیتے ہیں۔"
"ہائے ... کاش تم بھی یہی کرو۔"
"مگر ہم تو پارٹنر شپ میں بزنس ..."
"ہاں ... خیر!" وہ بے دلی سے بولی۔ "سوچیں گے اس پہ بھی"۔
"مڈل ایسٹ میں اچار اور چٹنی کی بڑی کھپت ہے۔"
"اب بس بھی کرو۔ اسی وقت اچار اور چٹنی بھی لے بیٹھے۔ وہ دیکھو
جہاں پانی شفق کی عنابی دھاریوں کو چھو رہا ہے"۔
"لاکھ برس بھی نہیں چھو سکتا ... زمین گول ہے"۔
"ایسا محسوس ہوتا ہے۔"
"لیکن ہم جاہل تو نہیں ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ فریب نظر ہے"

"ہائے تمہارا بھولا پن۔ اتنے پیارے لگتے ہو بیوقوفی کی باتیں کرتے وقت کہ کیا بتاؤں"۔

"کیا تم نے پہلی بار محبت کی ہے"۔

"بالکل پہلی بار ... اس سے پہلے کبھی کسی نے اتنا متاثر نہیں کیا کہ اس سے محبت کرنے لگتی۔ لیکن مجھ سے بہتوں نے محبت کی ہے"۔

"مجھے بتاؤ۔ ایک ایک کا سر توڑ دوں گا"۔

"پتا نہیں اب وہ کہاں ہوں گے۔ جب میں میٹرک میں تھی۔ لاہور کی بات ہے۔ پڑوس کے ایک صاحب کریلے سے چڑتے تھے۔ میں انہیں اپنی کھڑکی سے کریلا دکھایا کرتی تھی۔ پہلے تو بپھر کے دوڑتے تھے پھر محبت کرنے لگے تھے"۔

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ جب وہ محبت کرنے لگے تو میں نے کریلا دکھانا چھوڑ دیا ... سارا چارم ختم ہو گیا تھا"۔

"تمہیں ان کی محبت کا علم کیسے ہوا تھا"۔

"خط لکھا تھا میرے نام ..."

"کیا لکھا تھا"۔

"یہی کہ اگر تم نے محبت کا جواب محبت سے دیا تو میں باقاعدہ طور پر کریلے کھانے لگوں گا"۔

"پھر کیا ہوا تھا"۔

"میں نے لکھ دیا تھا کہ آپ کریلے کھائیں یا نہ کھائیں میں آپ سے محبت

نہیں کر سکتی۔ کیونکہ آپ کا قد بہت چھوٹا ہے ... دور سے بچے لگتے ہیں ...
اور خدا کی قسم میں نے بھی بچہ ہی سمجھ کر آپ کو کریلا دکھایا تھا۔ میرا قصور معاف
کیجئے اور بدستور کریلے سے چڑھتے رہیئے۔"

"کوئی اور بھی تھا؟"

"ہاں۔ ایک مصور تھا جس نے دور سے میری تصویر بنائی تھی۔ جو بالکل
میری دادی جان سے مشابہ تھی۔"

"اس نے بھی خط لکھا تھا۔"

"نہیں زبانی باتیں کی تھیں۔"

"کیا کہا تھا۔"

"یہی کہ تم میرے فن کی زندگی ہو۔ بکری کی تصویر بھی بنانے کی کوشش
کرتا ہوں تو تمہاری بن جاتی ہے۔ میں کیا کروں۔"

"پھر تم نے کیا کہا تھا۔"

"میں کیا کہتی۔ سب کچھ چپ چاپ سنتی رہتی تھی۔"

"وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہوگا۔"

"نہیں محلے والوں نے اسے مار پیٹ کر محلے سے نکال دیا تھا۔ دراصل
وہ ایسی ہی باتیں کئی لڑکیوں سے کر چکا تھا۔"

"تم اس سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھیں۔"

"شاید ہو جاتی اگر وہ محلے سے نکال نہ دیا جاتا۔"

"کیا خاص بات تھی اس میں۔"

"قہقہہ لگاتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے دھاڑیں مار کر رو رہا ہو۔"

"کیا بات ہوئی؟"

"روتے ہوئے مرد اچھے لگتے ہیں۔ تمہاری رونی صورت ہی نے تو
اتنا متاثر کیا ہے۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہے" لڑکے نے ٹھنڈی سانس لی۔

"تمہاری یہ مغموم آنکھیں مجھے بڑی پیاری لگتی ہیں۔"

"میرے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں ملا؟"

"نہیں! اتنی مکمل غم کی تصویر میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

"سارا قصور دھوتر مچھلی کا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بچپن ہی سے عادت رہی ہے کہ تنہائی میں دھوتر مچھلی کا سا منہ بنانے
کی کوشش کرتا رہتا تھا۔"

"کتنا رومینٹک پہلو ہے تمہاری زندگی کا۔"

"اچھا!" لڑکے کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ساری دنیا میں منفرد ہو۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"نہ محمد علی کی نہ وحید مراد کی۔ دھوتر مچھلی کی نقل اتارتے تھے۔"

"اب کیا کرتا اپنی افتادِ طبع کو۔"

"اسی لیے تم پر میری جان جاتی ہے۔ ہفت اقلیم کی سلطنت کے بدلے میں

بھی تمہیں نہ دوں "

"اور ہر حال میں مجھ سے محبت کرتی رہوگی"

"ہر حال میں... بڑے سے بڑا طوفان بھی میری محبت کا رُخ نہیں موڑ سکے گا تم دیکھ لینا"

"خواہ میری وجہ سے تمہاری زندگی ہی کیوں نہ خطرے میں پڑ جائے"

"تمہارے ہاتھوں مرجانا بھی مجھے گوارا ہوگا"

"لیکن شادی نہیں کروگی"

"اب سوچ رہی ہوں کہ کر ہی لوں"

"واہ اتنی جلدی خیال بدل دیا"

"محض دھوتر مچھلی کی وجہ سے"

"میں نہیں سمجھا"

"تنہائی میں تمہیں دھوتر مچھلی کا سامنہ بناتے ہوئے دیکھنے کی خواہش بڑی شدید ہوگئی ہے"

"واقعی بہت عجیب ہو"

"جب چھینک آنے سے پہلے منہ بناتے ہو اور چھینک کے بعد ناک سڑکتے ہو تو میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں گود میں اٹھا کر بھاگ جاؤں"

لڑکے نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا تھا اور وہ کہتی رہی تھی۔ "ایک بار ایک ایسا آدمی بھی پسند آیا تھا جو آستین سے ناک صاف کیا کرتا تھا لیکن اُس نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس لیے اُس سے محبت نہ ہوسکی۔ اچھا بتاؤ تمہیں

میری کون سی باتیں پسند ہیں"۔

"تم مجھے پوری کی پوری پسند ہو"۔

"میری کوئی حرکت جو بہت اچھی لگتی ہو"۔

"میں نے اس پہ ابھی تک غور ہی نہیں کیا"۔

"کب کرو گے"۔

"شادی کے بعد"۔

"اور اگر میں نے شادی نہ کی تو"۔

"تو پارٹنرشپ کے بعد غور کروں گا"۔

"سوال یہ ہے کہ تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں نہیں کرتے جیسی میں کرتی ہوں"۔

"باتوں سے کیا فائدہ؟"

"پھر وہی فائدہ ... فائدہ ... بنئے پن سے مجھے سخت نفرت ہے"۔

"اچھا اچھا۔ اب احتیاط برتوں گا"۔

"ہائے تمہارا یہی انداز تو مار ڈالتا ہے۔ فوراً میری بات مان لیتے ہو ... کتنے سوئیٹ ہو یہ بس میں ہی جانتی ہوں۔ تمہاری امی بھی تمہیں اس حد تک نہ جانتی ہوں گی جتنا میں جان گئی ہوں"۔

"پتہ نہیں"۔

"بس تمہاری لاعلمی ہی تھوڑا سا بور کرتی ہے۔ ارے ... اوہ ... اب تو اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ چلو واپس چلیں"۔

"وہ دیکھو شفق کا رنگ کتنا گہرا ہو گیا ہے"۔ لڑکے نے کہا

"ہاں ہے تو"

"اوپر سے بتدریج گہرا ہوتے ہوتے پانی کے قریب سیاہی مائل ہو گیا ہے۔"

"میں نے واپس چلنے کو کہا تھا"

"اور وہ اس چٹان پر بحری عقاب اس طرح پر تول رہا ہے . . جیسے رات آغاز زمستاں کے پرندے کی طرح اپنے پر تولتی ہے یہیں ہے . . ."

"یہیں سے کشتی موڑ لو ۔ !"

"عقاب اُڑ گیا . . . کتنا خوبصورت چکر کاٹا ہے چٹان کے گرد . . . شاید کہیں اور بسیرا لے گا"

"میں کہہ رہی ہوں . . . واپس چلو"

"یہاں سے ابد تک ہم دونوں . . . صرف ہم دونوں . . ."

"واپس چلو . . . !" وہ زور سے چیخی ۔

"اوہ اچھا . . . !" لڑکا چونک کر بولا تھا اور موٹر بوٹ موڑی تھی لیکن وہ ساحل کی طرف جانے کی بجائے پچاس گز کے دائرے میں چکر کاٹنے لگی ۔

"یہ کیا کر رہے ہو" لڑکی نے جھلا کر پوچھا ۔

"مم . . . میں . . . کک . . . کچھ نہیں" لڑکا ہکلا کر رہ گیا ۔

"پھر ساحل کی طرف کیوں نہیں چلتے"

"کک . . . کچھ گڑ بڑ ہو گئی ہے . . ."

"تو ٹھیک کرو"

"کک . . . کر تو . . . رہا ہوں . . ." لڑکے کی آواز سے مایوسی اور گھبراہٹ

ظاہر ہو رہی تھی۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ ایکسپرٹ ہو۔"

"وہ تو ہوں... لیکن... مشینری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا.. اب کیا ہوگا۔"

"اب کیا ہوگا کے بچے... کچھ کرو۔"

"ارے... تم کیسی باتیں کر رہی ہو... ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ تمہارے ساتھ مرجانا بھی گوارا کرلوں گی۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخی "اسے ٹھیک کرو۔"

"کیسے کردوں۔ میں تو... !"

موٹر بوٹ اسی طرح چکر کاٹنے جارہی تھی۔ اور وہ بوکھلا بوکھلا کر اسٹیئرنگ گھمانے کی کوشش کرتا جارہا تھا لیکن اسٹیئرنگ جام ہو کر رہ گیا تھا.. "اے خدا ہم سچے محبت کرنے والے ہیں!" وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔

"اسے ٹھیک کرو۔" لڑکی پاگلوں کی طرح چیخی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن تم اس طرح کیوں ہیشش آرہی ہو۔ اگر ہم غرق بھی ہو گئے تو ہماری روحیں ابد تک ساتھ رہیں گی۔ کچھ دیر پہلے ہم ایسی ہی تو باتیں کر رہے تھے۔"

"چپ رہو خبیث۔ اسے ٹھیک کرو۔"

"تمہارا لہجہ صدمہ پہنچا رہا ہے مجھے۔"

"تم جہنم میں جاؤ... اسے ٹھیک کرو۔"

"دیکھو اس وقت میری شکل بالکل دھوتر مچھلی کی سی نکل آئی ہے۔"

"چپ رہو... سؤر کے بچے... اسے ٹھیک کرو"۔

"تم مجھے گالیاں دے رہی ہو... جبکہ... جبکہ..."

"ارے خبیث تجھے ہوا کیا ہے۔ اسے ٹھیک کر"

"مجھ سے تو ٹھیک نہیں ہوگی۔ میں کچھ نہیں جانتا انجن کے بارے میں"۔

"کتے کے پلے تجھے خدا غارت کرے اب ہم غرق ہو جائیں گے"۔

"ہاں یہ تو ہے" لڑکے نے بڑے رسان سے کہا "ٹھیک آٹھ بجے ٹائیڈ آتی ہے۔ میں تو مطمئن ہوں کہ دنیا میں تمہاری جدائی سے بچ گیا۔ دونوں کی روحیں ساتھ رہیں گی"۔

"کمینے... کتے... ذلیل... سؤر کے بچے۔ اسے ٹھیک کر"۔

اور پھر اُس پر "اسے ٹھیک کر" کا دورہ پڑ گیا تھا۔ چیختے چیختے بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔

تب اُس لڑکے کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور جھک کر اس نے لوہے کا وہ ٹکڑا نکال لیا تھا جو اسٹیئرنگ کی گراری میں پھنسا ہوا تھا...۔

اور اب موٹر بوٹ ساحل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اُس نے بیہوش لڑکی کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا "سؤر کا بچہ محبوب" اور پھر زور سے ہنس پڑا۔

☆

ہپّی مُراد

نوجوان ہی تھا مگر گریجویٹ بھی تھا لیکن ہپّی بن گیا تھا ۔ عجیب دھج تھی ۔ لباس میلا اور بے ڈھنگا ، چرس کے دھوئیں کی بو میں بسا ہوا ۔ بے تحاشا بڑھے ہوئے سر اور ڈاڑھی کے بال ۔ عام ہپیوں کی طرح مارا مارا نہیں پھرتا تھا بلکہ اس سلسلے میں اس نے ایک جدت کی تھی ۔ ایک گدھا خرید لیا تھا اور اس پہ بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تھا ۔ آواز بڑی اچھی تھی ۔ تھوڑا سا دخل فن موسیقی میں بھی رکھتا تھا ۔ اس لیئے اس کی خاصی آؤ بھگت ہوتی تھی ۔ اور اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ چرس اور گدھے کا خرچ نکل آئے ۔ رہی پیٹ بھرنے کی بات تو اس کا قول تھا کہ جس نے یہ تنور بنایا ہے وہی اس کو بھرے گا بھی ۔

جن لوگوں نے اسے بحیثیت طالب علم دیکھا تھا وہ اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کہ ایک بہترین دماغ ضائع ہو گیا ۔

جدید ذہن اور غیر ملکی انداز فکر رکھنے والی خواتین میں بہت مقبول تھا ۔ پڑھا لکھا اور ذہین بھی تھا ۔ اس لئے وہ ان کے درمیان درویش بھی بن جاتا تھا ۔ کسی کو تعویذ لکھ کر دے رہا ہے ، کسی کے لئے گنڈا بنا رہا ہے اور کسی کے لیئے اپنے مخصوص انداز میں دعائیں کر رہا ہے ۔

کبھی کبھار منشیات کے اسمگلرز کے بھی ہتھے چڑھ جاتا اور وہ اس سے منشیات کی تقسیم کا کام بھی لیتے دراصل ادنچے طبقے کی عورتوں میں وہ مقبول تھا ا لئے ان کے درمیان ہیروئن وغیرہ کی تقسیم میں اسے آسان ہوتی تھی ۔ کبھی کبھ پولیس بھی اسے استعمال کرتی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے انفارمر بھی بن جاتا ... کسی کام میں بھی پیچھے نہیں تھا ۔

ایک دن اس کا فارسی کے استاد سے ٹکراؤ ہوگیا ۔ مولانا خلیل درانی جنہوں نے اسے میٹرک میں فارسی اور اردو پڑھائی تھی، اس کا گریبان تھام کر اسے گدھے اتار لیا ۔ دو تین تھپڑ رسید کئے اور اسی طرح کھینچتے ہوئے اپنے گھر لے آئے بیٹھک میں بٹھا دیا ۔ اور وہ چھڑی اٹھائی جس سے اپنے طالب علموں کی مرمت کرتے تھے ۔ ہپی حسب قدیم گڑگڑانے لگا "م ... مولانا صاحب ! معاف کر دیں اب کبھی آپ کی نظروں کے سامنے نہیں آؤں گا ۔"

"مردود، تو نے یہ کیا حلیہ بنایا ہے ؟" مولوی صاحب بید ہلا کر گرجے ۔

"میں نے نہیں بنایا مولوی صاحب وقت نے اس حال کو پہنچایا ہے ۔ سبھی اپ طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں کون کس کی سنتا ہے ۔"

"لیکن تجھے میری سننی پڑے گی ۔ میرا حق ہے تجھ پر ۔ ارے ظالم ... تو کیسے نہ خیالات رکھتا تھا ۔ دین سے تیری دل چسپی اسکول میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تو ایک پولیس والے کا بیٹا ہے، پھر یہ تجھے کیا ہو گیا ...

ہپی مراد اس حوالے پر بے ساختہ رو پڑا ۔ ہچکیاں لگ گئیں ۔ مولوی صاحب نے پانی کا گلاس پیش کیا جب کچھ جی سنبھلا تو بولا "میرا باپ پولیس والا ضرور تھا

مولوی صاحب لیکن میں اس وقت جو کچھ بھی تھا اسی کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ وہ بڑا اچھا آدمی تھا مولوی صاحب۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور کوئی شرعی عیب اس میں نہیں پایا جاتا تھا۔ چار افراد کا مختصر سا خاندان تھا۔ میں تھا' میری چھوٹی بہن تھی اور ماں تھی۔ رشوت کی ایک پائی گھر میں نہیں آتی تھی کبھی۔ خالص تنخواہ پہ گزارا تھا۔ اسی میں ہم دونوں بھائی بہنوں کی تعلیم بھی ہو رہی تھی۔ لیکن میری ماں بڑی بے صبری تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی حیثیت سے اونچے لوگوں کی ریس کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن باپ کے آگے ایک نہ چلتی۔ ہائی اسکولوں کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے کئی چھوٹے موٹے ٹیوشن کر لئے اور ان سے اپنے اور بہن کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے لگا باپ بہت خوش ہوا۔ اس طرح بار کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ پولیس والوں میں وہ شاہ جی کہلاتا تھا۔ ہیڈ کانسٹبل تھا۔ اور کسی تھانے پر بھی اسے کوئی تھانے دار رکھنے پہ تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر اُسے ہیڈ آفس کی محرری پہ لگا دیا گیا۔ یہاں بھی آمدنی کے بہتیرے ذریعے تھے لیکن قصہ انفرادی آمدنی کا تھا۔ لہٰذا یہ میرے باپ کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ کسی سے کچھ لیتا یا نہیں۔ اس آمدنی میں کوئی اس کا حصہ دار نہیں تھا کہ اسے میرے باپ سے شکایت کا موقع ملتا۔ بہرحال شاہ جی سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے اور میری ماں دن بھر دانت پیستی اور کلکلاتی رہتی۔ لیکن بہرحال جب ہم تینوں مل کر اسے سمجھاتے تو کچھ دنوں کے لئے نرم پڑ جاتی۔ ہمیں کہیں کوئی سرکاری کوارٹر نہیں ملا تھا۔ کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور خدا کے فضل و کرم سے ہمارا گھرانا محلے میں نیک نام تھا۔ لوگ ہماری عزت کرتے تھے۔

پھر اچانک ہماری بدنصیبی کا دور شروع ہوا۔ ہمارے برابر کا مکان خالی ہوا

اور معلوم ہوا کہ اسے انکم ٹیکس کے ایک تپے دار نے کرائے پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ میرے والد سے ملا اور اس بات پر بڑی خوشی ظاہر کی کہ اسے ان کا پڑوسی بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

پھر جب اس کا سامان آنے لگا تو میری ماں کی آنکھیں کھل گئیں۔ فریج بھی تھا، ٹی وی بھی تھا، دو موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ چھ سات افراد پر اس کا کنبہ مشتمل تھا۔ جس شام وہ لوگ آئے ہمارے مہمان رہے۔ میرے باپ نے ان کا چولہا نہیں جلنے دیا۔ ہمارے گھر سے کھانا پک کر گیا تھا۔ میری ماں نے باوا سے پوچھا۔ "کیا تپے دار کوئی بہت بڑا افسر ہوتا ہے؟"

"ارے نہیں!" باوا ہنس کر بولے۔ "اس محکمے کے چپراسی تپے دار کہلاتے ہیں۔ یہ تاجروں اور انکم ٹیکس ادا کرنے والوں کے پاس نوٹس لے جاتے ہیں۔"

"اللہ کی قدرت! یہ چپراسی ہے!" ماں سینہ پیٹ کر بولی۔ "اور تم ہیڈ کانسٹیبل ہو کر گھر میں چوہے لوٹ رہے ہیں۔"

"بس بس۔ زیادہ باتیں نہیں۔" باپ نے بگڑ کر کہا اور معاملہ اس وقت رفع دفع ہو گیا۔ لیکن میری ماں کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ دوسرے دن تپے دار کے گھر کی عورتیں ہمارے ہاں آئیں۔ اور انہیں زیورات سے لدا پھندا دیکھ کر ماں کی حالت اور غیر ہوئی۔ ان کے جاتے ہی تو اس نے طوفان برپا کر دیا۔ باوا ڈیوٹی پر تھے۔ بس ہم دونوں بھائی بہن کی مرمت ہوتی رہی۔

باوا سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ تپے دار صاحب اسکوٹر پر دفتر تشریف لے جاتے تھے اور دوسرا اسکوٹر ان کے فرزند ارجمند کے استعمال میں رہتا

تھا۔ وہ دسویں درجہ کے طالب علم تھے۔ ماں اس پر بھی کلکلاتی۔ مجھ سے کہتی دیکھ تیرا باپ ہیڈ کانسٹیبل ہے اور تو بسوں میں لٹک کر کالج جاتا ہے"۔

میں کہتا "ماں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ نہیں دیکھتی کہ مجھ سے عمر میں کتنا بڑا ہے لیکن ابھی تک ہائی اسکول ہی میں پڑا ہوا ہے"۔

وہ مجھے بھی صلواتیں سناتی اور ساتھ ہی باوا جان کو بھی لپیٹ لیتی۔ بہر حال اس تپے دار کے پڑوسی بننے سے ہمارے گھر کا سکون رخصت ہوگیا تھا۔ باوا جی کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرنے لگے اور ہم دونوں بھائی بہن بس کیا بتائیں کیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دنوں آئے دن تپے دار صاحب کے یہاں تقریبات ہوتی رہتیں۔ آج کسی کی سالگرہ ہے، کل کسی کی بسم اللہ، پرسوں کسی کا عقیقہ برادری سمیت کھانا ہوتا اور میری ماں انگاروں پر لوٹتی رہتی۔

بہر حال، اب میری ماں نے میری بہن کے حوالے سے بات شروع کی باوا کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتی اور ایسی سناتی کہ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ کہتی "اس بھنگڑ خانے میں بیٹی کا رشتہ کیسے آئے گا۔ جہیز کے بغیر بیٹیاں کہاں اٹھتی ہیں؟"

اسی دوران میں تپے دار کی ایک بیٹی کی شادی ٹھہر گئی۔ وہ دھوم دھڑ کا ہوا کہ اہل محلہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بارات تھی کہ گاڑیوں کا جلوس تھا۔ کسٹم کے کلرک کو بیاہی گئی تھی۔ بَری کے سامان کو دیکھ کر ماں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے اور پھر جہیز کا کیا کہنا۔ رات کو ماں پہ دل دورہ پڑا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیم ڈاکٹر سبھی آئے اور خدا خدا کر کے کسی طرح سکون ہوا۔ صبح اٹھتے ہی پھر باوا کی شامت آئی۔ بس کیا بتاؤں

مولوی صاحب وہ کس طرح دھاڑیں مار مار کر روئے تھے، اب سوچتا ہوں تو میرا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔

آخر ماں سے بولے "تم ہی کچھ کرو۔ مجھ سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں کسی سے کچھ کہہ سکوں۔ تمہاری کئی صوبیداربیوں سے میل ملاقات ہے۔"

ماں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہم دونوں بھائی بہن دنگ رہ گئے۔ لیکن ہمارے لئے دم بخود رہنے کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔

پھر باپ تو ہیڈ آفس ڈیوٹی پر چلے گئے اور اماں نے رکشا منگوایا اور شہر کے سب سے بدنام تھانے کے انچارج کی بیوی سے ملنے کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔ ہم دونوں بھائی بہن پریشان ہوتے رہے، تو گویا اب باوا رشوت کا دھندا کریں گے۔ ماں کے کہنے سننے میں آکر۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کی پیشانی پر سجدوں کا نشان چمکنے لگا۔ میں نے سوچا نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ باواجان اس راہ پر نہیں جا سکتے۔ لیکن مولوی صاحب ہوا وہی جو بالآخر ہمارے مقدر میں تھا۔ تھانے کے صوبے دار نے اپنا اثرورسوخ استعمال کر کے باواجان کو ہیڈ آفس کی محرری سے ہٹوا کر تھانے کی محرری پہ لگا دیا۔ اس تھانے کا علاقہ بدمعاشوں کا گڑھ تھا۔ کئی بڑے جوئے خانے پولیس کی زیر سرپرستی چلتے تھے۔ منشیات کی غیر قانونی تقسیم بھی وہیں سے ہوتی تھی۔ اس سے تھانے کو روزانہ ہزاروں کی

آمدنی ہوتی تھی ۔ وصولیابی پہ باوا جان لگائے گئے تھے ۔

جس وقت وہ اپنا حصہ لے کر گھر میں داخل ہوتے تھے ماں کی باچھیں کھل جاتیں ۔ بیٹی کے جہیز کا سامان تیار ہونے لگا ۔ سال بھر کے بعد بیٹی کی ایسی شادی کی کہ ٹیپے دار صاحب کے بھی چھکے چھوٹ گئے لیکن میرے باپ کا یہ عالم تھا کہ اب اپنی اولاد سے بھی آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا ۔ گھر میں ہوتا تو زیادہ تر اپنے کمرے میں پڑا رہتا ۔ باہر نکلتا تو آنکھیں خون کبوتر ہوتیں ۔ مسجد جانا چھوڑ دیا تھا ۔ گھر ہی پہ نماز پڑھ لیتا ایسا لگتا تھا جیسے اب اسے نماز پڑھتے ہوئے بھی شرم آتی ہو ۔ ایک دن میں نے کہا باوا جان آپ کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی ۔ اب تو آمنہ کی شادی بھی ہو گئی ۔ اب آجایئے اپنی راہ پہ "۔

گلوگیر آواز میں بولے ۔ "بیٹے ! اب میری واپسی بہت مشکل ہے ۔ ان کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کروں گا ۔ تو سیدھا جیل جاؤں گا ۔"

میں خاموش رہا ۔ اتنی عقل تو میں بھی رکھتا تھا ۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ صدر اسکندر مرزا کی حکومت کا خاتمہ جنرل ایوب خاں کے ہاتھوں ہو گیا ۔ ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ۔ سماجی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش شروع کر دی گئی ۔ پورا شہر صاف ستھرا نظر آنے لگا ۔ سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ناجائز پاپیش باغ راتوں رات کاٹ دیئے گئے ۔ اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ ایک جوئے خانے پہ اس وقت چھاپہ پڑا جب میرے باوا جان وہاں تھانے کا حصہ وصول کرنے پہنچے تھے ۔ وہ بھی دھر

لٹے گئے۔ لیکن دم بخود تھے۔ پھر انہوں نے سارا الزام اپنے سر لے لیا
یہی کہا کہ وہ ذاتی طور پہ ایسا کہتے تھے۔ تھانے کے انچارج کو اس
کا علم نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ ملٹری کورٹ میں ان پہ مقدمہ چلا اور
تین دن کے اندر انہیں دس سال کی سزا ہوگئی۔ ہم لوگوں کی بہت بُری
حالت تھی۔ محلے والوں سے عجیب عجیب ریمارک سننے میں آتے۔ ادھر ماں کا یہ
عالم تھا کہ چپ لگ گئی اور پھر ایک دن سچ مچ ان پہ دل کا دورہ پڑا اور وہ
اس سے جانبر نہ ہوسکیں۔ میں تنہا رہ گیا۔ بی اے کر چکا تھا۔ سوچ رہا تھا، کہ
ایم۔ اے میں داخلہ لوں گا۔ لیکن بات جہاں کی تہاں رہ گئی۔ بہن کی سسرال
والوں نے بھی اب قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس کے شوہر نے صاف کہہ دیا کہ اگر
اب تم نے مائیکے کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھا تو طلاق دے دوں گا۔ اور
پھر مولوی صاحب... مُراد علی... ہپّی مُراد بن گیا۔"

"لیکن بدبخت! تجھے تو اس سے سبق سیکھنا چاہیئے تھا۔" مولوی صاحب
جو بہت زیادہ متاثر نظر آ رہے تھے گلوگیر آواز میں بولے۔

"میں نے یہی سبق سیکھا ہے مولوی صاحب! اپنے معاشرے کے قول و
فعل کے تضاد سے تنگ آگیا ہوں۔ آپ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کریں گے
مولوی صاحب؟"

"میں اپنے علاقے میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"آپ ایک بار کہہ رہے تھے کہ آپ پیرزادے بھی ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ میں اپنے علاقے کے گدی نشین کا بیٹا ہوں۔ اور والد صاحب

کے بعد میں ہی گدی سنبھالوں گا۔"

"پھر آپ اپنے علاقے کے لئے کیا کریں گے؟"

"رشد و ہدایت کے علاوہ اور کیا کروں گا۔"

"اس کے باوجود بھی آپ کے علاقے کے مسلمان مسلمانوں ہی کے ہاتھوں قتل ہوتے رہیں گے۔ پرانی خاندانی رنجشیں رنگ لاتی رہیں گی اور آپ بیٹھے دم دیکھا کریں گے۔ جیسے آپ کے والد صاحب دیکھتے رہتے ہیں۔"

مولوی صاحب نے چھڑی اٹھائی اور مراد سر جھکا کر بولا "اتنا ماریئے کہ آج میں مر ہی جاؤں ورنہ مجھے جانے دیجئے۔ میں اپنا کام کروں اور آپ اپنے رشد و ہدایت میں لگ جایئے۔"

مولوی صاحب نے چھڑی ایک طرف رکھ دی۔ اور اداس آنکھوں سے ہپتی کو دیکھتے رہے۔ پھر ان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے رخسار پر ڈھلک آئے۔

پیشگوئی کا شکار

کرائم رپورٹرز انور دشواری میں پڑ گیا تھا۔ کوئی جرم نہیں سرزد ہوا تھا اس سے
بس ایک پیش گوئی الٹی آنتوں کی طرح گلے پڑ گئی تھی۔

ریالٹو میں انسپکٹر آصف کے ساتھ کافی پی رہا تھا۔ اتفاقاً قریب ہی سے ایک
آرٹسٹ گذرا۔

"تمہاری زندگی کے دن تھوڑے ہیں" انور کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا
انور نے آرٹسٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا "کیا تم اسے نہیں پہچانتے"۔

"دیکھا تو ہے کہیں!"

"اخبارات اور رسائل میں تصاویر دیکھی ہوں گی"۔

"ہاں۔ شاید...!"

"تجریدی مصوری کے بڑے نقادوں میں سے ہے۔ اور خود بھی مصور ہے
... آفاقی کہلاتا ہے"۔

"اچھا تو یہ... وہ ہے!" آصف روا روی میں بولا تھا۔ پھر سنبھل کر انور کو
گھورنے لگا تھا۔

"لیکن تم نے کیا کہا تھا اسے دیکھ کر...؟"

"مجھے یاد نہیں!" انور نے شانوں کو جنبش دی تھی۔

"تم نے کہا تھا کہ اس کی زندگی کے دن تھوڑے ہیں"۔

"کثرت سے پیتا ہے۔ جگر چھلنی ہو کر رہ گیا ہے کسی دن پیتے ہی پیتے ختم ہو جائے گا۔" بات آئی گئی ہو گئی تھی۔

لیکن دو دن بعد ہی انسپکٹر آصف محاورۃً اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن گیا کیونکہ آفاقی کی لاش اسی صبح کو اس کے اسٹوڈیو میں پائی گئی تھی اور وہ شراب پی کر نہیں مرا تھا بلکہ ریوالور کی گولی لگی تھی سینے میں۔ اور ریوالور بھی لاش کے قریب ہی پڑا پایا گیا تھا۔

آصف نے حکماً اسے موقع واردات پر طلب کر لیا۔

"پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔" آصف انور کو گھورتا ہوا بولا۔ "آفاقی سے تمہارا جھگڑا بھی ہوا تھا۔"

"بہت تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو۔" انور نے خشک لہجے میں کہا۔

"اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں اپنی پوزیشن صاف کرنی ہے۔"

"میری پوزیشن ۔۔۔!"

"ہاں، اب مجھے تمہارا لہجہ بھی یاد آ رہا ہے۔"

"اوہ ۔۔۔ وہ ریالٹو والی بات۔"

"ہاں وہی۔ آخر تم نے کس بنا پر کہا تھا کہ اس کی زندگی کے دن تھوڑے ہیں؟"

"شاید میں نے اسی وقت وضاحت کر دی تھی۔"

"میں اسے تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔"

"اچھا تو پھر کھل کر بات کرو۔"

"پندرہ دن پہلے تمہارا اس سے جھگڑا ہوا تھا۔"

"آصف صاحب! کیا اس لاش پہ نظر پڑتے ہی آپ نے میرے ماضی کے پندرہ دن پھلانگ لیے تھے۔"

"کیا مطلب!"

"اتنی جلدی تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ پندرہ دن قبل میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا۔"

"میں چیونٹی کی چال نہیں چلتا۔"

"بڑھاپے میں بھی اس دم خم پہ مبارک باد قبول کرو۔"

"کیا تم حراست میں لیے جانے کے بعد ہی ڈھنگ سے گفتگو کرو گے۔"

"کیا میں ابھی تک کتوں کی طرح بھونکتا رہا ہوں۔"

"میں پوچھ رہا ہوں کیا پندرہ دن پہلے تمہارا اس سے جھگڑا ہوا تھا۔"

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اسے پندرہ ہی دن گذرے ہیں۔"

"یعنی تمہیں اعتراف ہے۔"

"ہاں مجھے اعتراف ہے لیکن اس شبہے کے ساتھ کہ وقت کے تعین میں کہیں تم غلطی تو نہیں کر رہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"بارہ دن بھی ہو سکتے ہیں اور اٹھارہ دن بھی۔"

"جھگڑا کس بات پہ ہوا تھا؟"

"اتنی غیر اہم بات تھی کہ مجھے دن بھی یاد نہیں۔"

"میں پوچھ رہا ہوں . . ."

"ٹھہرو۔" انور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آپ سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں! جس نے تمہیں یہ اطلاع دی ہے اس نے جھگڑے کی وجہ بھی بتائی ہوگی۔"

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں . . ."

"شاید پکاسو کی ایک پینٹنگ زیرِ بحث تھی! میں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ اس پر آفاقی بولا تھا یہ صحافت نہیں ہے فن ہے۔ ظاہر ہے جہالت کے اس مظاہرے پر مجھے بھڑک اٹھنا پڑا ہوگا! لیکن جب اس نے گالیاں بکنی شروع کیں تو مجھے احساس ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔"

"اس نے گالیاں دی تھیں تمہیں۔"

"کہہ تو دیا کہ نشے میں تھا۔"

"بہر حال اس کا احساس ہوتے ہی تم نے بات نہیں بڑھائی تھی اور وہاں سے اٹھ گئے تھے۔"

"یہی ہوا تھا۔"

"لیکن اس حرکت پر تم نے اپنی توہین ضرور محسوس کی ہوگی۔"

اس حد تک بھی نہیں کہ پندرہ دن بعد اسے قتل کر دیتا۔"

"اب وقت کا تعین کیسے ہو گیا۔" آصف جلدی سے بولا۔

"تمہارے بیان کے مطابق۔" انور اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ "اب تم مجھے بتاؤ کہ اتنی جلدی تمہیں اس سے میرے جھگڑے کا علم کیسے ہوا۔"

"بس ہو گیا۔ میرا طریق کار۔"

"کیا میں قریب سے اس کی لاش دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیوں کیا کوئی ثبوت ضائع کرنے کا ارادہ ہے"۔

"زمین ہی پہ رہو!" انور واپسی کے لئے مڑا تھا۔

"ٹھہرو!" آصف اس کا بازو پکڑتا ہوا بولا۔ "بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

"وہ تو مزید پندرہ دن تک بھی جاری رہ سکتی ہے"۔

"آج سے چار دن قبل رشیدہ سے بھی اس کا جھگڑا ہوا تھا... اور ٹھیک اس کے دو دن بعد تم نے اس کی زندگی کے تھوڑے دنوں کی بات کی تھی۔"

انور طویل سانس لے کر رہ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ "رشیدہ سے جھگڑے کا علم نہیں ہے مجھے۔"

"اس سے یہیں اسٹوڈیو میں پھر جھگڑا ہوا تھا۔"

"وہ یہاں آئی تھی؟" انور نے متحیرانہ انداز میں سوال کیا۔

"میری معلومات کے مطابق اس سے یہیں جھگڑا ہوا تھا۔"

"مجھے اس واقعے کا علم نہیں! رشیدہ نے ذکر نہیں کیا۔ اوہ میں نے پوچھا تھا کیا میں اس کی لاش دیکھ سکتا ہوں، لاش کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی کی جانے سے قبل دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"آلۂ قتل بھی لاش کے قریب ہی پڑا ملا ہے۔" آصف نے انور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اب بھی وہیں پڑا ہے۔"

"نہیں ... فنگر پرنٹ کے لئے اٹھا لیا گیا ہے"۔

"کیا واقعی تم یہی سمجھتے ہو کہ اس ریوالور پر میری ہی انگلیوں کے نشانات ہوا گے"۔ آصف نے ایک بار پھر اُسے گھورا تھا۔

انور نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ منتخب کیا تھا اور اسے سلگانے لگا تھا! آصف خاموشی سے اس کے چہرے پر نظر جمائے رہا۔

"مجھے یہاں کتنی دیر رکنا ہے"۔ بالآخر انور نے پوچھا۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ جب تک مجھے لاش پر ایک نظر ڈال لینے کا موقع نہ مل جائے اس وقت تک رکنا ہے؟"

آصف برا سا منہ بنا کر بولا" مائی ڈیر مسٹر انور تم شاید سمجھتے ہو کہ میں اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں تم سے مدد کا خواہاں ہوں۔"

"کوئی نئی بات نہیں پہلے بھی بارہا ایسا ہو چکا ہے"۔

"لیکن اس بار ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دوستی اپنی جگہ لیکن میں ایک ذمہ دار آفیسر بھی ہوں"۔

"وہ تو شکل ہی سے ظاہر ہے"۔

"انور!"

"جی انسپکٹر صاحب!"

آصف کچھ کہنے کی بجائے دوسری طرف مڑ گیا۔ آفاقی کے اسٹوڈیو سے ایک کانسٹیبل برآمد ہو کر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"کوئی عورت فون پر آفاقی کو پوچھ رہی ہے جناب!" کانسٹیبل نے آصف

سے کہا "میں نے اسے ہولڈ آن کرنے کو کہا ہے۔"

"اوہ۔۔!" آصف دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ انور نے اس کے پیچھے جانے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ شاید اندر پہنچ کر ہی آصف کو احساس ہوا تھا کہ انور بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑا تھا! اس نے مڑ کر اسے گھورا تھا۔

"تم لاش کے قریب نہیں جاؤ گے۔۔۔ یہیں ٹھیرو۔" اس نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ انور جہاں تھا وہیں رُک گیا۔

ایک نامکمل تصویر ایزل پر تھی اور ایزل کے قریب ہی آفاقی فرش پر چت پڑا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کے پاس ایک برش پڑا نظر آیا جس میں سرخ رنگ لگا ہوا تھا۔

تصویر نامکمل بھی کہی جا سکتی تھی اور مکمل بھی کیونکہ وہ ایک تجریدی تصویر تھی اور اسے تصویر بھی صرف تجرید کرنے والے مصور ہی کہہ سکتے تھے ورنہ انور کے لئے تو وہ محض رنگوں کی لیپا پوتی تھی اور تجریدی مصوروں کو وہ رنگ ساز کہتا تھا۔

آصف تھوڑی دیر بعد اس کی طرف پلٹ آیا۔

"ایزل پر جو تصویر ہے۔۔۔" انور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اور وہ برش جو اس کے ہاتھ کے قریب پڑا ہوا ہے۔۔۔"

"فی الحال کوئی مشورہ نہ دو!" آصف نے اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی دخل اندازی کی۔ انور نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے اور اسے گھورنے لگا۔

"جانتے ہو، فون پر کون تھی؟"

"شاید لیڈی میکبتھ۔۔۔!"

"تم دونوں خطرے میں ہو آگاہ کئے دیتا ہوں۔"

"تو کیا وہ رشیدہ کی کال تھی ۔"

"میں اس کی آواز پہچانتا ہوں۔"

"میرے سوال کا جواب دو۔" انور بھنا کر بولا۔

"اس نے نام نہیں بتایا.. لیکن میں نے آواز پہچانی تھی۔"

"کیا کہہ رہی تھی ؟"

"آفاقی سے بات کرنا چاہتی تھی ۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس وقت اسٹوڈیو میں کیا ہو رہا ہے ؟"

"پوچھا تھا اس نے ؟"

"میں کل کی پیداوار نہیں ہوں۔"

"نہیں تم تو قلوپطرہ کے ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے۔"

"بکواس بند کرو ! اور یہ بتاؤ کہ تم دونوں پچھلی رات کو کہاں تھے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ قتل پچھلی رات ہی کو ہوا تھا۔"

"یہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتائے گی۔"

لہٰذا رپورٹ ملنے سے قبل اس قسم کے سوالات نہ کرو تمہیں آنے والوں کے لئے اچھی مثال قائم کرنی چاہئے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

"پچھلی رات میں نے کرنل فریدی کے ساتھ ان کی نجی تجربہ گاہ میں گزاری تھی اور صبح کا ناشتہ انہی کے ساتھ کر کے ڈیوٹی پر پہنچا۔"

آصف بُرا سا منہ بنا کر بولا "میں تصدیق کئے بغیر یقین نہیں کر سکتا۔"

"فون نمبر بتاؤں فریدی صاحب کا"

"جی نہیں، میں جانتا ہوں، لیکن رشیدہ!"

"رشیدہ کی طرف سے تمہارے کسی سوال کا جواب دینا میرے بس سے باہر ہے"

"خیر... خیر... میں رشیدہ کو بھی دیکھوں گا۔ چار دن قبل اس نے آفاقی کو جوڈو کے ہاتھ دکھائے تھے"

"اوہ... !" انور ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔

"جی !" آصف اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا غرایا۔

"اگر چار دن قبل اس انداز کا جھگڑا ہوا تھا دونوں کے درمیان تو کم از کم رشیدہ اتنی جلد بازی سے کام نہیں لے سکتی... وہ چار کے چالیس دن بناتی اور اس تاک میں رہتی کہ کسی اور سے بھی آفاقی کا جھگڑا ہو جائے۔ ویسے آخر تم صرف ہمی دونوں پر کیوں اتنا زور دے رہے ہو۔ آفاقی کا تو روز ہی کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا"

آصف کچھ نہ بولا! وہ اس پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جس کے بارے میں انور نے تھوڑی دیر قبل کچھ کہنا چاہا۔

انور بھی ہونٹ بھینچے ہوئے تصویر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر بولا" وہ سرخ لکیریں قطعی غیر متوازن ہیں"

"کیا مطلب؟"

"تصویر سے الگ کوئی چیز معلوم ہوتی ہیں"

"شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ زخمی ہو جانے کے بعد اس نے وہ برش استعمال کیا تھا" آصف نے لاش کے ہاتھ کے قریب پڑے برش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی خیال ہے۔۔"

آصف تیزی سے ایزل کی طرف جھپٹا تھا۔ جھک کر ان سرخ لکیروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تھی اور وہ بے چارگانہ انداز میں انور کی طرف مڑا تھا۔

"اِدھر آؤ۔"

انور کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھا تھا اور پھر پل بھر کے لیے گویا اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔

"تمہارا خیال غلط نہیں تھا۔" آصف طنزیہ اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ "تم خود دیکھ لو کہ اس نے مرنے سے قبل کیا لکھا تھا۔"

کلر اسکیم کے مطابق سرخ رنگ غیر متوازن ضرور تھا لیکن وہ لکیریں لایعنی نہیں تھیں۔ تھوڑا سا غور کرنے پر "انور" صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ شاید اس نے "انور" کے آگے بھی کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن برش ایک بے ہنگم سی لکیر کھینچتا ہوا اس کے ساتھ ہی فرش پر آ پڑا تھا۔

انور نے احمقانہ انداز میں آصف کی طرف دیکھا اور آصف نے سخت لہجے میں کہا۔

"فائر کرنے والے نے اس پر فائر کیا اور ریوالور یہیں پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ شاید اس نے یہ معلوم کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ اس کا شکار فوری طور پر ختم ہو گیا یا محض معمولی سا زخمی ہوا ہے۔ آفاقی سمجھ گیا تھا کہ وار مہلک ہوا ہے لہٰذا اس نے برش اٹھایا اور کچھ لکھتے لکھتے ختم ہو گیا۔۔۔ اور کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔ اب تم جا سکتے ہو۔" آصف نے خشک لہجے میں کہا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملنے کے بعد ہی دیکھا جائے گا۔"

انور نے اپنی گدی سہلائی تھی اور واپسی کے لیے مڑ گیا تھا — وہ اسے کسی طرح بھی نہیں جھٹلا سکتا تھا کہ کینواس پہ "انور" نہیں لکھا ہوا تھا — لیکن آخر وہ کون ہو سکتا ہے جس نے آصف کو خصوصیت سے اس کے اور رشیدہ کے خلاف معلومات فراہم کی تھیں! کیا یہ ممکن نہیں کہ خود قاتل ہی نے کینواس پہ اس کا نام لکھ دیا ہو۔

یہ تو طے تھا کہ آصف نے خود اسی کے توجہ دلانے سے قبل کینواس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا ورنہ پہلے ہی اس کا گریبان پکڑ کر پوچھتا کہ آخر اس پینٹنگ پہ اس کے نام کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

انور سوچتا ہوا اپنی موٹر سائیکل تک آیا... قاتل بے حد چالاک معلوم ہوتا ہے۔ اس سارے سٹ اپ کا مطلب یہی ہو سکتا ہے۔ اس نے پولیس کو باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اس نے آفاقی پہ فائر کیا اور گھبراہٹ میں ریوالور وہیں پھینک کر فرار ہو گیا۔ پھر آفاقی اتنی دیر تک زندہ رہا تھا کہ ایزل تک جا کر کینواس پہ کچھ لکھ سکے۔

جو کچھ قاتل نے پولیس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی وہ ناقابل یقین بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے کسی ذریعے سے آصف تک آفاقی سے اُن دونوں کے جھگڑے کی کہانی بھی پہنچا دی۔ ورنہ آفاقی تو ایسا آدمی تھا کہ اپنے اسٹوڈیو کے قریب بھونکنے والے کتوں تک سے لڑ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ خود انور نے ایک بار اسے نشے کی حالت میں ایک کتے کی نقل اتارتے دیکھا تھا۔ خود بھی جھلاہٹ میں اس کتے کی طرح بھونکنے لگا تھا جو اس کے اسٹوڈیو کے قریب ہی شور مچا رہا تھا۔ وہ فطرتاً جھگڑالو تھا! بات بات پہ تنقید کرتا تھا اور ایسے انداز میں کہ مقابل ہاتھ ہی چھوڑ بیٹھے

یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ پندرہ دن قبل انور سے جھگڑا ہونے کے بعد کسی نے اس کی لڑائی ہی نہ ہوئی ہو یا مرنے سے چار دن قبل رشیدہ سے جھگڑنے کے بعد کسی اور سے نہ الجھا ہو۔

بہرحال اب جلد از جلد رشیدہ تک پہنچنا ضروری ہوگیا تھا۔ آصف کے بیان کے مطابق اس سے تو ہاتھا پائی تک کی نوبت آگئی تھی۔ لیکن انور اس پر یقین کر لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

* * *

"وہ بلیک میلر تھا" رشیدہ پیر پٹخ کر بولی۔

"میں تم سے صرف یہ پوچھ رہا ہوں کیا تم نے اسے مارا تھا" انور نے خشک لہجے میں سوال کیا تھا۔

"اس نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔۔ میں بھی جوڈو کا ایک داؤ آز بیٹھی۔۔۔ کئی فٹ کے فاصلے پر جا پڑا تھا"

"یہ واقعہ کہاں ہوا تھا"

"سپر لیس کلب میں"

"وہاں کون کون موجود تھا"

"درجنوں افراد تھے، کس کس کا نام لوں۔ کچھ میرے لئے اجنبی بھی تھے"

"بات کیا ہوئی تھی؟"

"بتایا نا کہ وہ بلیک میلر تھا"

"تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"نہیں میری ایک ملنے والی کو عرصہ سے بلیک میل کر رہا تھا"۔

"کیسے ...؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی ... خواہ کچھ ہو، تم فکر کیوں کرتے ہو۔ اگر انہوں نے مجھے
شبہے میں گرفتار کیا تو عدالت میں جواب دہی کر لوں گی"۔

"رشو کی بچی قصہ یہ نہیں ہے"۔

"پھر کیا بات ہے؟"

انور نے اسے پوری روداد سنائی تھی۔ اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ کینوس پر انور ہی لکھا ہوا تھا ...؟"

"اتنا یقین جتنا اپنے انور ہونے پر ہے"۔

"تب تو خطرناک بات ہے"۔

"اسی صورت میں خطرناک ہو سکتی ہے جب قتل پچھلی رات نو بجے سے قبل یا آج
صبح سات بجے کے بعد ہوا ہو"۔

"کیوں ...؟ تم ان اوقات میں کہاں تھے؟"

"کرنل صاحب کے ساتھ"۔

"اب دیکھو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟" رشیدہ نے فکر مندانہ انداز
میں کہا۔

"تم اس سے اپنے جھگڑے کا پورا واقعہ سناؤ"۔ انور بولا۔

"کئی ماہ پہلے کی بات ہے کہ آفاقی نے میری ایک سہیلی سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ
کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس بار رقم وصول ہوتے ہی وہ اس کے خلاف استعمال کیے

جانے والا سارا مواد اسے واپس کر دے گا۔ لیکن رقم وصول کر لینے کے بعد وعدے سے پھر گیا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ وہ مواد اس سے حاصل کر لوں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ا دن پریس کلب میں بھی میں نے اسے ہموار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھڑک اٹھا مجھے تمہاری داشتہ کہا تھا اس نے۔"

"کیا الفاظ استعمال کئے تھے؟" انور نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

"چیخ کر بولا تھا... انور کی داشتہ چپ رہ! لوگ چونک کر ہمیں دیکھنے لگے تھے اور مجھے غصہ آگیا تھا۔ اسی دوران میں اس نے میرا ہاتھ بھی پکڑنے کی کوشش کی تھی بس پھر میں نے اسے اچھال پھینکا۔"

"انور کی داشتہ... !" انور آہستہ سے بڑبڑایا۔

"میں سمجھتی ہوں تم کس نتیجے پر پہنچ رہے ہو!" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"کیا سمجھتی ہو... ؟"

"تمہارے بیان کے مطابق اس نے انور کے آگے بھی کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ تم یہی سوچ رہے ہو کہ اس نے کینوس پر بھی "انور کی داشتہ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ اور یہ بھی سوچ سکتے ہو کہ پہلے بھی ایک آدھ کو گولی کا نشانہ بنا چکی ہوں۔"

"سنو! میں سوچوں یا نہ سوچوں اگر یہ سیٹ اپ ہے تو پھر ہمارے جھگڑے کی اطلاع آصف تک پہنچانے والے نے اسے یہ بھی بتایا ہوگا کہ آفاقی نے تمہارے لئے کس قسم کے الفاظ استعمال کئے تھے؟"

"لازمی بات ہے!" رشیدہ سر ہلا کر بولی۔

"جس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بھی الجھ گئی ہو؟"

"دیکھا جائے گا!" رشیدہ نے لاپرواہی سے کہا۔

"بہرحال مجھے نہیں معلوم تھا کہ آفاقی بلیک میلر بھی تھا۔" انور نے طویل سانس لے کر کہا۔

اسی شام کو آصف نے فون پر انور کو اطلاع دی کہ وہ فریدی سے تصدیق کر چکا ہے! اس نے وہ رات اسی کے ساتھ گذاری تھی اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق آفاقی کی موت پچھلی رات نو اور بارہ بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس کے اور رشیدہ کے ہاتھوں کے پرنٹ چاہتا ہے

"وہ کس لئے؟" انور نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"ریوالور پر پائے جانے والے نشانات سے موازنہ کرنے کے لئے۔" آصف کی آواز آئی۔

"کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ آفاقی رشیدہ کا نام نہیں لیتا تھا۔ انور کی داشتہ کہتا تھا... کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے کینوس پر انور کی داشتہ ہی لکھنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن صرف انور لکھ کر ختم ہو گیا ہو گا۔ تحریر کا انداز بتاتا ہے کہ وہ کچھ اور بھی لکھنا چاہتا تھا..."

"کسی کو بھیج کر پرنٹس منگوا لو... ہم دونوں ایک گھنٹے تک دفتر ہی میں مل سکیں گے" انور نے کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ رشیدہ قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی اسے معلوم ہوا تو بولی "آنے دو میں ضرور دوں گی اپنے ہاتھوں کے پرنٹس! دو سال سے میں

نے کسی آتشی اسلحے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

تھوڑی دیر بعد پھر فون کی گھنٹی بجی تھی۔ انور نے ریسیور اٹھایا اس بار دوسری طرف سے کرنل فریدی کی آواز آئی تھی۔

"کیا قصہ ہے ؟"

"آصف کی عنایت ہے!" انور نے کہا اور ایک بار پھر پوری روداد دوہرانے لگا

"پھر کیا خیال ہے ؟" فریدی نے بات ختم ہونے پر پوچھا تھا "کروں دخل اندازی"

"نہیں... میں خود دیکھ لوں گا۔ ویسے اگر اس شخص کے بارے میں جلد معلوم ہو جاتا تو بہتر تھا جس نے میرے بارے میں اور رشیدہ سے متعلق آصف کو معلومات فراہم کی ہیں"

"معلوم کروں ؟"

"بس اتنا ہی کر دیجئے! پھر میں خود ہی نپٹ لوں گا۔"

"موقع واردات پر آصف کی موجودگی باضابطہ نہیں تھی۔ حلقے کے انسپکٹر نے صرف فنگر پرنٹ سیکشن سے اجازت طلب کی تھی" فریدی نے اطلاع دی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شروع ہی سے کسی نے آصف کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔"

"فکر نہ کرو، میں ابھی دیکھتا ہوں..." دوسری طرف سے آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پھر رشیدہ اپنے ہاتھوں کے پرنٹس تیار کر کے لائی تھی۔ اور انور سے پوچھا تھا "تمہارے لئے بھی لاؤں پرنٹنگ انک یا پریس ہی میں جا کر پرنٹ لو گے۔"

"بس تمہارے ہی پرنٹس کافی ہوں گے۔" انور خشک لہجے میں بولا۔ اور رشیدہ پرنٹس رکھ کر چلی گئی۔

آصف نے کسی کو بھیجا نہیں تھا بلکہ تھوڑی دیر بعد ہی خود ہی نازل ہو گیا تھا۔

"رشیدہ کے بارے میں تم نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔" انور اسے گھورتا ہوا بولا۔ "آفاقی سے اس کا جھگڑا اسٹوڈیو میں نہیں پریس کلب میں ہوا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے... !"

"پڑتا ہے فرق، جس نے تمہیں یہ ساری معلومات فراہم کی ہیں وہ اوّل درجے کا جھوٹا ہے۔"

"جھگڑا ہوا تھا چاہے جہاں ہوا ہو۔ میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں کہ جھگڑے کی وجہ کیا تھی۔"

"رشیدہ گھر جا چکی ہے۔ جھگڑے کی وجہ میں بتائے دیتا ہوں۔ آفاقی نے بھرے مجمع میں اسے میری داشتہ کہا تھا۔"

"اور رشیدہ نے اس پہ ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔"

"وہ تو صرف ایک مجہول سا آدمی تھا، کوئی پولیس آفیسر بھی ایسی کوئی بات کر دیکھے اس پر بھی ہاتھ چھوڑ دے گی۔"

"خیر... خیر... پرنٹ کہاں ہیں؟"

انور نے میز کی دراز سے پرنٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "... نے رشیدہ سے جھگڑے کی جگہ غلط بتائی تھی کیا اس کی وجہ بتا سکو گے؟"

"مجھے یاد نہیں رہا تھا، بتانے والے نے شاید پریس کلب ہی کی بات کی تھی"

"اور تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ اطلاع دینے والا کون ہے ۔ ۔ ۔؟"

"نہیں، میں تو محکمے کے سارے کونفیڈنشل فائیلز بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔" آصف بھنا کر بولا۔

"تمہاری مرضی!" انور نے شانوں کو جنبش دی اور آصف کی طرف سے توجہ ہٹا کر سامنے پڑے ہوئے پیڈ پہ کچھ لکھنے لگا۔

"رشیدہ، پچھلی رات نو سے بارہ کے درمیان کہاں تھی!" آصف نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا پتہ تمہیں معلوم ہے۔ جا کر پوچھ لو۔" انور نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"تم آدمیوں کی طرح بات کیوں نہیں کر رہے!"

"اگر کتوں کی طرح بات کی ہوتی تو تم یہاں نظر نہ آتے۔"

"زیادہ اکڑ دکھانے کی ضرورت نہیں رشیدہ کی گردن ابھی پھنسی ہوئی ہے۔"

"یہ اطلاع براہ راست رشیدہ ہی کو دینی چاہیے۔ مجھے کیوں بور کر رہے ہو۔ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

آصف اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا اٹھ گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

انور فلیٹ میں پہنچا تو رشیدہ نے بتایا کہ آصف آدھے گھنٹے تک اس سے پوچھ گچھ کرتا رہا تھا۔

"جہنم میں جائے ۔ ۔ ۔ میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔"

"جب تک پچھلا حساب بے باق نہیں کرو گے قرض نہیں دے سکوں گی۔"

"تمہاری مرضی ... ! ذرا ٹھہرو، تمہارے لہجے میں بھی بے پروائی پائی جاتی ہے کیا قصہ ہے۔"

"تم پچھلی رات کرنل صاحب کے ساتھ تھے اس لئے بچ گئے۔"

"اچھا تو پھر ... !"

"میں اپنے فلیٹ سے باہر نہیں نکلی تھی لیکن میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لئے میری گردن پھنس گئی ہے۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو ... ؟"

"یہی کہ اگر مجھے عمر قید یا پھانسی ہو گئی تو تم سے اپنا قرض کیسے وصول کروں گی۔ لہٰذا سگریٹ کے بغیر ہی گذارہ کر لو۔"

"ایسا تھپڑ رسید کروں گا کہ بتیسی باہر آ جائے گی۔ جاؤ دوڑ کر ایک پیکٹ لے لاؤں بھی خود ہی ..."

"بہت خوش نظر آ رہی ہو ... آخر قصہ کیا ہے ؟"

"اس ریوالور پر جو موقع واردات پر ملا ہے خود آفاقی ہی کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں ... اس سے ایک فائر بھی کیا گیا تھا لیکن آفاقی کے جسم سے نکالی جانے والی دونوں گولیاں اعشاریہ دو پانچ کے پستول سے چلائی گئی تھیں۔"

"کیا آصف نے بتایا ہے تمہیں !"

"وہ تو خواہ مخواہ دہلاتا رہتا ہے۔ وہ کیوں بتاتا۔"

"پھر کیسے معلوم ہوئیں یہ باتیں۔"

"کچھ دیر پہلے کرنل صاحب کی کال آئی تھی۔"

"میرے لئے ... !"

"ہاں ... میں نے رسیدیہ کی بھتی اور تم نے جس شخص کے بارے میں ان سے پوچھ
اس کا نام سُن کر متحیّر رہ جاؤ گے"۔

"کون ہے؟"

"ہمارے ہی اخبار کا ایک سب ایڈیٹر"۔

"نہیں!" انور چونک پڑا۔

"رشید جبار ... !"

"بہت خوب ... ! تو وہ آصف کو ہم دونوں کی راہ پر لگاتا رہا ہے! تب تو
حرکت بھی اسی کی ہوگی"۔

"کون سی حرکت ... ؟"

"پینٹنگ پر میرا نام آفاقی کی بجائے خود اسی نے لکھا ہوگا"۔

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آفاقی کا قاتل رشید ہی ہے"۔

"اگر نہیں ہے تو خواہ مخواہ ہمیں الجھانے کی کوشش کیوں کی"۔

"کسی کا آلۂ کار بھی ہو سکتا ہے"۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ... اگر خود قاتل نہیں ہے تو ..." انور جملہ پورا!
بغیر خاموش ہو گیا۔ دفعتاً اُسے کچھ یاد آگیا تھا۔

وہ اٹھ گیا اور دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا "میں پتا نہیں کب واپس آؤ
"پوری بات بھی تو سنتے جاؤ"۔

"اب کیا باقی بچا ہے"۔ وہ رک کر مڑا ...

"پینٹنگ پر تحریر آفاقی ہی کی تھی۔ کرنل صاحب کے بیان کے مطابق یہ ایکسپرٹ کی رائے ہے۔"

انور پھر پلٹ آیا... اور کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔" اب تو لے ہی آؤ سگریٹ!"

"ارے ارے! اب تو ایسا لگتا ہے جیسے تم نے باہر جانے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا ہو۔"

"یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ وہ تحریر آفاقی ہی کی ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی..."

"تمہارا نام ہے۔"

"ہوا کرے نام۔ قاتل میں نہیں ہو سکتا! بس یہ دیکھنا پڑے گا کہ آخر رشید جبار کو کیا تکلیف تھی۔ اگر وہ خود قاتل نہیں بھی ہے تو کم از کم قتل کے بعد آفاقی کے اسٹوڈیو ضرور پہنچا تھا۔ اور ایزل پہ میرا نام دیکھ لینے کے بعد ہی آصف کی توجہ میری طرف مبذول کرائی تھی۔ کیا تم جانتی ہو کہ رشید کہاں رہتا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"آصف کا پڑوسی ہے۔ لہٰذا آصف کو اس سے پوچھنا چاہیئے کہ وہ پچھلی رات نو سے بارہ کے درمیان کہاں تھا... آخر وہ اسٹوڈیو کیوں گیا تھا۔ میں نے کبھی اُسے آفاقی کے ساتھ بھی نہیں دیکھا کہ خصوصی تعلقات کا سوال پیدا ہو سکے۔"

"سنو! آفاقی بلیک میلر تھا! ہو سکتا ہے۔ اسی چکر میں اس کا قتل بھی ہوا ہو!"

"امکان ہے... جس ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اس سے ایک فائر بھی کیا گیا تھا حملہ آور پر اس نے ایک فائر بھی کیا تھا۔ لیکن خود اس کے سینے

یں دو گولیاں پیوست ہو چکی تھیں۔ اور حملہ آور اتنی جلدی میں تھا کہ اس نے یہ تک دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ آفاقی فوراً مر گیا یا... اوہ... ٹھہرو...!

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر ہلا کر بولا "نہیں رشو صاحبہ حملہ آور گھاگ قسم کا آدمی نہیں معلوم ہوتا... ہو سکتا ہے وہ کوئی عورت ہو... تمہاری سہیلی بھی ہو سکتی ہے... کیا وہ قتل کر سکتی ہے؟"

"ہرگز نہیں... قتل کا ارادہ کرتے ہی بیہوش ہو جائے گی اتنی نروس قسم کی ہے۔ نام بتا سکتی ہوں... لیکن پتا نہیں بتاؤں گی۔ رازداری کی قسم کھا چکی ہوں۔"

"بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے دو فائر کئے اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر قبل گفتگو کے دوران میں فوری اشتعال کے تحت اس نے پستول نکال کر فائر کر دیا ہو۔ جواباً آفاقی نے بھی ریوالور نکال لیا ہو۔ لیکن صرف کارتوس ضائع کرنے کے لئے... حملہ آور نے دوسرا فائر بھی کیا اور اُسے گرتے دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی... لیکن پھر... تصدیق کی سوجھی ہو گی۔ مر بھی گیا یا نہیں... ایسے حالات میں... تم خود سوچو... کیا وہ دوبارہ اسٹوڈیو تک آئی ہو گی۔!"

"کم از کم میری سہیلی کے لئے ناممکن ہے۔"

"پھر کیا اس کا رازدار کوئی مرد نہیں ہو سکتا جس نے اس کے لئے تصدیق کی ہو۔"

"ممکن ہے..."

"اگر یہ مرد اپنا رشید جبّار ہی نکلے تو کیا مضائقہ ہے!"

"میری سہیلی شادی شدہ ہے... اور اب کوئی بوائے فرینڈ نہیں رکھتی۔ شادی سے قبل کے کسی بوائے فرینڈ ہی کے سلسلے میں بلیک میل ہوتی رہی ہے۔"

"فرض کرد... وہ سابقہ لوائے فرینڈ ہی اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا ہو
اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی نے آفاقی پر فائر کئے ہوں اور اس کے ہاتھ میں بھی ریوالو
کرنا گ نکلا ہو... اور کچھ دیر بعد پھر اسٹوڈیو کا چکر لگایا ہو... یہ دیکھنے کے
کہ اس کا حملہ کارگر بھی ہوا تھا یا نہیں! اس طرح عورت حملہ آور سرے سے ہی خا
از بحث ہو جاتی ہے... نہیں دوست... مجھے یہ دیکھنا پڑے گا۔ اس سب ا
کے نیچے کو..."

* * *

"رشید جبار اسٹار کے فلمی شعبے کا انچارج تھا۔ جب وہ ڈیوٹی پر نہیں ہو
ان اوقات میں انور اخبار کے سابقہ فلم میگزین کے شمارے نکلواتا اور انہیں بغور د
رہتا... رشید پر اس نے قطعی نہیں ظاہر ہونے دیا تھا کہ اُسے اس کی اس حرکت
ہو گیا ہے جو اس نے رشیدہ اور اس کے خلاف کی تھی۔
اور پھر ایک شام اس نے اس قسم کی چھان بین کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔ چہرے پر کچھ ایسے
اثرات تھے۔ دفتر سے اٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔
لیکن اپنے فلیٹ میں جانے کی بجائے رشیدہ کے فلیٹ کا دروازہ بجایا
اور کچھ دیر بعد اندر سے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور رش
بے رُخی سے بولی تھی " میں تنہائی چاہتی ہوں "
"تمہارے اس رویے پر مجھے حیرت نہیں ہوگی۔ کیونکہ تم فلیٹ میں تنہا نہیں
"کیا مطلب... !"

"وہ خاتون تمہارے ہی فلیٹ میں تشریف رکھتی ہیں۔ جن کی گاڑی نیچے کھڑی ہوئی ہے۔"

"آہستہ بولو۔"

"کوئی بات نہیں۔" انور بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا۔ صرف پچاس روپے ادھار دے دو۔"

رشیدہ نے دانت پیسے تھے اور چپ چاپ دروازہ بند کر لیا تھا۔ لیکن واپسی میں دیر بھی نہیں لگائی تھی۔ پچاس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"دیکھوں گی تمہیں۔" وہ اس کی طرف نوٹ بڑھاتی ہوئی بولی تھی۔ انور فلیٹ میں آگیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد رشیدہ آئی تھی اور میز پر رکھی ہوئی وزنی ڈکشنری انور پر کھینچ ماری تھی۔ لیکن وہ غافل نہیں تھا۔ جھکائی دے گیا۔

"گندے... بلیک میلر... رشیدہ دانت پیس کر بولی۔

"مسوڑھے لہولہان ہو جائیں گے۔ دانتوں پر رحم کرو۔"

"دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا درندگی ہے۔"

"اس طرح ہم سبھی درندے ٹھہرے، ویسے ہم نے یہ کیونکر سمجھ لیا کہ میں تمہاری اس سہیلی کا اشتہار بن جاؤں گا۔ جو آفاقی کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تمہاری گوبھی سی شکل دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ پچاس روپوں کی شدید ضرورت میں مبتلا ہوں۔"

"میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ تم اتنے گر جاؤ گے۔"

"کوئی اور بات بھی ہے کیا؟" انور نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا

"اور اب تم اُسے بلیک میل کر رہے ہو؟"

"خواب تو نہیں دیکھ رہیں۔"

"کسی نے اُسے فون پر آگاہ کیا ہے کہ آفاقی کے مرجانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اُسے ادائیگی جاری رکھنی پڑے گی۔"

"اور وہ میں ہی ہو سکتا ہوں۔"

"میرے یا تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نہیں ہو تو تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ اسی کی گاڑی تھی اور وہ اس وقت فلیٹ میں موجود ہے۔ میں نے تمہیں اس کا نام یا پتا نہیں بتایا تھا۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تمہاری سہیلی کا قاتلہ ہونا بھی بعید از امکان نہیں۔ لہٰذا میرے لئے ضروری تھا کہ اس کا بھی پتہ لگاتا۔ ان تین دنوں کے دوران میں تم اس سے پانچ بار اس کے گھر پر مل چکی ہو، اور چھٹی بار اس وقت یہاں اپنے فلیٹ ہی میں ملاقات کر رہی تھیں۔"

"تم میرا تعاقب کرتے رہے ہو۔"

"اگر آفاقی اپنی پینٹنگ پر میرا نام لکھ کر نہ مرا ہوتا تو مجھے ذرّہ برابر بھی نہ تمہاری پرواہ ہوتی اور نہ تمہاری کسی سہیلی کی۔"

رشیدہ نے خاموشی اختیار کر لی، اور منہ پھلائے ہوئے ایک طرف بیٹھ گئی۔ لیکن آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔

"تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ قاتل نے آفاقی کے اس سرمائے پر بھی قبضہ کر لیا ہوگا جس کے ذریعہ وہ کمائی کر رہا تھا یعنی بلیک میلنگ کا سارا ہی مواد لے اڑا

ہو اس طرح خود سنبھال لی ہو آفاق کی جگہ۔" رشیدہ خاموش رہی انور نے جیب سے
پچاس کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔" دفع ہو جاؤ۔ اور اب ادھر کا
رخ کیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

رشیدہ نوٹ واپس لئے بغیر اٹھی تھی اور باہر چلی گئی تھی۔ انور نے فون پر کسی
کے نمبر ڈائیل کیئے رسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"کرسٹی ہوٹل۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کیا مینجر صاحب ہیں؟"

"جی فرمایئے..."

"میں اداکارہ مس کنول کا سیکریٹری ہوں جناب کیا مس کنول اس وقت وہاں
تشریف رکھتی ہیں؟"

"جی ہاں! کیا کوئی پیغام ہے؟"

"ضروری بات ہے! میں خود ہی پہنچ رہا ہوں۔ بہت بہت شکریہ۔" انور
نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

پھر وہ دوبارہ باہر جانے کے لئے لباس تبدیل کرنے لگا! تھوڑی دیر بعد
اس کی موٹر سائیکل ہوٹل کرسٹی کی طرف رواں دواں نظر آئی تھی۔

ہوٹل کرسٹی تین فلم اسٹوڈیوز کے درمیان محل وقوع رکھنے کی بنا پر زیادہ
تر فلمی اداکاروں ہی سے آباد رہا کرتا تھا۔

٭

انور کے روانہ ہوتے ہی رشیدہ نے اپنا اسکوٹر سنبھالا تھا تھوڑی دیر قبل

والی گفتگو نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ انور اس کی سہیلی ہی پہ توجہ دے رہا ہے۔ ویسے
وہ اس سلسلے میں حقیقتہً انور سے خفا نہیں تھی۔ جسے بھی اس کی سہیلی کے حالات
کا علم ہوتا شبہے میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

بہر حال وہ انور کا تعاقب کرتی ہوئی ہوٹل کرسٹی تک آئی تھی خاصے فاصلے
سے تعاقب کیا تھا اور اس کی دانست میں انور کو تعاقب کا علم بھی نہیں ہو سکا تھا۔
اس نے اسے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہاں پہنچ کر رشیدہ
نے خود کو چھپائے رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خود بھی ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی
"انور کی توجہ ایک مخصوص میز کی طرف تھی... اوہ... تو وہ اداکارہ کنول کو گھور
رہا تھا... رشیدہ نے طویل سانس لی... پہلی ہی نظر میں اس نے اس ابھرتی ہوئی
اداکارہ کو پہچان لیا تھا۔ وہ اپنی میز پہ تنہا تھی۔

"خداوندا...! وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ تو یہ قصہ ہے! رشید جبار کی فیورٹ
... وہ ان دنوں بڑی شد و مد سے اس کی پبلسٹی کر رہا تھا۔ زیادہ دنوں کی بات
نہیں تھی کہ کنول نے ایک ایکسٹرا کی حیثیت سے اپنے فلمی کریئر کا آغاز کیا تھا اور
دیکھتے ہی دیکھتے ہیروئن بن گئی تھی۔ اور اس میں واضح طور پہ رشید جبار کا ہاتھ تھا۔
انور نے کنول کے قریب ہی والی ایک میز منتخب کی تھی اور بیٹھ ہی رہا تھا
کہ رشیدہ بھی پہنچ گئی۔ انور نے اسے گھور کر دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔
وہ بیٹھ گئے کنول کی پشت ان کی طرف تھی... اسے بھی شاید کسی کا انتظار تھا
بار بار صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

رشیدہ انور کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی "آخر اس بیچاری

نے کیا قصور کیا ہے؟"

"ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بھی بتائی جائے"۔ انور نے کہا تھا اور ویٹر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کافی اور لِبرگرز کا آرڈر دے کر اس نے رشیدہ سے کہا "تم ضرورت سے زیادہ تیز بننے کی کوشش کرتی ہو... آخر میں تمہاری سہیلی کو کیوں بخش دوں؟"

"بات ختم ہو چکی تھی"۔

"ابھی تو بات شروع بھی نہیں ہوئی"۔

"کیا مطلب... !"

انور نے صدر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر رشیدہ کی طرف متوجہ ہو گیا

"اُدھر مت دیکھنا"۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"میں دیکھ چکی ہوں! وہ ادھر ہی آ رہا ہے!"

"ایسی بن جاؤ جیسے تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں ہے"۔ انور نے کہا۔ "میں یہیں اسی وقت ڈراپ سین کرنا چاہتا ہوں"۔

"یعنی کہ..."

"بیگم ترمذی..."

"تم پاگل ہو گئے ہو... میں پھر کہتی ہوں کہ میری سہیلی کے ہاتھ صاف ہیں"۔

"اس کے باوجود بھی بیگم ترمذی کے بغیر بات نہیں بنے گی"۔

کنول اب میز پر تنہا نہیں تھی۔ وہ اُس کے مقابل بیٹھ چکا تھا جسے دیکھ کر انور اور رشیدہ نے کنول کی میز کی طرف سے توجہ ہٹالی تھی۔ یہ رشید جبّار تھا۔ رشیدہ کی

آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔ اور وہ بار بار ان دونوں کو دیکھنے لگتا تھا۔ انور
رشیدہ سر جھکائے آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے۔

دفعتاً انور اٹھا اور کنول کی میز کے قریب جا کھڑا ہوا... رشید کے چہرے
پر زردی پھیل گئی تھی لیکن وہ فوراً ہی سنبھالا لے کر بولا" اوہ بیٹھو... بیٹھو! میں تو
ہی تمہیں انوائٹ کرنے والا تھا۔"

"شکریہ!" انور تیسری کرسی سنبھالتا ہوا بولا...
"مس رشیدہ کو بھی... اگر کوئی حرج نہ ہو..."

"قطعی نہیں" انور کسی قدر اونچی آواز میں بولا" پارٹنر تم بھی ادھر ہی آجاؤ"
رشیدہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اٹھی تھی اور اسی میز پر آگئی تھی۔ ا
نے رشید جبار کو بتایا کہ وہ اپنا آرڈر پلیس کر چکا ہے۔

"کوئی بات نہیں... ہمارے کھاتے میں جائے گا" رشید جلدی سے بولا۔
"مس کنول کے لئے بھی شاید ہم لوگ اجنبی نہیں ہیں" انور نے مسکرا کر کہا
"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا" رشید نے کنول کی طرف دیکھا۔

"تو پھر تعارف کرا ہی دو نا" کنول اٹھلائی۔ انداز عامیانہ سا تھا۔ رشید
برا سا منہ بنائے ہوئے دوسری کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ تعارف ہوا۔ دو چار
رسمی جملے ادا کئے گئے... اور پھر اچانک انور نے دھماکا کیا۔

"آفاقی مرتے وقت اس پینٹنگ پر حملہ آور کا پورا نام نہیں لکھ سکا تھا
رشید جبار کے چہرے پر بادل سا آکر گذر گیا!

"اس وقت اس کا کیا ذکر انور صاحب!" اس کی آواز کانپ گئی۔

"میرے لئے ہر وقت کا چکر بن گیا ہے یہ مسئلہ ... اگر میں نے وہ رات کرنل زیدی کے ساتھ نہ گذاری ہوتی تو پھندا میری ہی گردن میں پڑا ہوتا۔"

کوئی کچھ نہ بولا۔ رشیدہ محسوس کر رہی تھی کہ کنول کی حالت بھی بگڑ رہی ہے اس کے چہرے پر اسے اندرونی کش مکش کے آثار نظر آئے تھے۔

"سوال یہ ہے کہ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ اس ذکر کو نکال بیٹھو۔ رشید جبار نے لہجے میں ناگواری پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اگر مجھے بیگم ترمذی کا پیکٹ مل جائے تو میں اپنی زبان بند ہی رکھوں گا ... کیونکہ اس شہر میں انور ادھا کو کوئی نہیں جانتا۔"

"تم جانتے ہو۔" رشید جبار کی زبان سے بے اختیار نکلا تھا اور پھر ذرا سا منہ کا آیا تھا۔ جیسے غیر ارادی طور پر سرزد ہو جانے والی کسی حماقت کا احساس ہو گیا ہو۔

"کیا بکواس ہو رہی ہے ..." کنول کپکپائی ہوئی آواز میں بولی اور اٹھ گئی۔

"پھانسی کے پھندے کو آواز نہ دو... بیٹھ جاؤ۔" انور نے سخت لہجے میں کہا "میں نے صرف بیگم ترمذی والے مواد کا مطالبہ کیا ہے! اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"پتا نہیں کہاں کی ہانک رہے ہو۔" رشید جبار بولا۔

"یقین کرو میں تم لوگوں کا پارٹنر بھی بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اور نہ مجھے آفاقی سے ہمدردی رہی ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

رشید ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ کنول دوبارہ بیٹھ گئی تھی اور خوف زدہ نظروں سے انور کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"آج سے دس سال پہلے"۔ انور نے جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا "جب آفاقی رحیم آباد میں رہتا تھا۔ اس کی ایک سیکرٹیری انورا دھا ہوا کرتی تھی جو اب اداکارہ کنول کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے"۔

"یہ سراسر غلط بیانی ہے"۔ رشید جبار گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

"اور اس غلط بیانی کے مرتکب بھی تم ہی ہوئے تھے۔ آج سے پانچ سال پہلے تم نے مس کنول سے متعلق پہلا مضمون لکھا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا آج کی ایکسٹرا کل کی ہیروئن... تم نے اس میں نہ صرف مس کنول کے خاندانی نام انورادھا کا ذکر کیا تھا بلکہ ان کی دکھ بھری زندگی کے بعض واقعات بھی لکھے تھے۔ رحیم آباد کے ایک نام نہاد مصور کا بھی تذکرہ تھا جس نے بہت دنوں تک مس کنول کو ایک طرح سے اپنا غلام بنائے رکھا تھا"۔

رشید جبار کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا تھا اور چھت کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

انور نے خاموش ہو کر کنول کے چہرے پر نظر جما دی اور پھر مسکرا کر بولا "بیچارے صحافیوں کو اتنا لکھنا پڑتا ہے کہ انہیں ایک ماہ کی تحریروں کا بھی دھیان نہیں رہتا۔ یہ تو پانچ سال پہلے کی تحریر کی بات ہے... لیکن مس کنول آپ کو یہ ضرور یاد ہو گا کہ آپ نے ایک سال پہلے ذاتی تحفظ کے لئے اعشاریہ دو پانچ کے پستول کا لائسنس حاصل کیا تھا۔ ویسے مجھے یاد ہے کہ وہ پستول آپ نے کس دکان سے خریدا تھا۔ پستول کا میک اور نمبر کیا ہے... اور پولیس بڑی آسانی سے ان پستولوں کو شناخت کر لیتی ہے جن کی گولیاں لاشوں سے حاصل کرتی ہے"۔

"تمہارا مطالبہ پورا ہو جائے گا" رشید جبار بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا تھا

٭

اسی رات کو گیارہ بجے انور رشیدہ فلیٹ کے سٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان والی چھوٹی میز پر براؤن رنگ کا ایک پیکٹ رکھا ہوا تھا

"تمہاری سہیلی کا کام بن گیا ہے..." انور رشیدہ کو گھورتا ہوا بولا۔ "لیکن اس پیکٹ کی قیمت پانچ ہزار ہے"

"تو کیا اب تم اسے بلیک میل کرو گے"

"نہیں حق المحنت! ہوا میری غذا کبھی نہیں بن سکی"۔

"وہ ادا کر دے گی پانچ ہزار... لیکن کیا تم سچ مچ ان دونوں کو پولیس کے حوالے نہیں کرو گے"۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب میں ان دونوں کو زندگی بھر بلیک میل کرتا رہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ پہلے تم یہ پیکٹ بیگم ترمذی سے چیک کرالو... کہ ان دونوں نے اس میں سے کچھ رکھ نہ لیا ہو۔ اس کے بعد میں آصف کو انورا د سے متعلق ٹیپ کر دوں گا... بیچارہ آخاقی پورا نام نہیں لکھ سکا تھا" انور بعد کا الف کھینچتا ہوا ڈھیر ہو گیا تھا"

رشیدہ کچھ نہ بولی۔ انور چھت کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اور وہ بڑی لگاوٹ کی نظروں سے انور کو دیکھے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انور نے طویل سانس لے کر کہا "رشید جبار سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے خواہ مخواہ آصف کو ہم دونوں سے آفاقی کے جھگڑے کے بارے میں مطلع کیا! اگر اس سلسلے میں خاموشی اختیار

تو اس کی طرف کسی کا دھیان تک نہ جاتا۔ بس اناڑی پن سمجھ لو... ایسے سارے مجرم ہمیشہ بڑی آسانی سے پولیس کے ہاتھ آجاتے ہیں جو اپنا جرم کسی اور کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"لیکن قتل کس نے کیا آفاق کو کنول نے یا اس نے؟" رشیدہ نے سوال کیا!

"اس کے بیان کے مطابق کنول نے اس پہ دو فائر کیئے تھے اور اسٹوڈیو سے نکل بھاگی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ہی اسٹوڈیو گئے تھے۔ وہ باہر کھڑا تھا اور کنول اندر گئی تھی۔"

"آخر کیوں؟"

"میں نے نہیں پوچھا۔ مجھے تو صرف تمہاری سہیلی کے معاملے سے دلچسپی تھی۔ ویسے اس نے بتایا ہے کہ آفاق نے کسی معاملے میں کنول کو بھی بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ اس سے ہمیشہ کے لیئے چھٹکارا چاہتی تھی۔ اور یہ احمق جس کا نام رشید جبار ہے اعانت جرم کے لیئے تیار ہو گیا کیونکہ بری طرح اس پہ جان دیتا ہے"

"اور تم نے اس دوران میں اس کے خریدے ہوئے پستول کے نمبر تک معلوم کر لیئے تھے؟"

"جب نام اور دھا سامنے آیا تو اس کے بارے میں معلوم کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اسلحہ خانہ کے ریکارڈ روم سے کسی پستول کے لائسنس کے حصول اور خریداری کے بارے میں بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال پستول ہی کے حوالے سے نروس ہو کر اس نے کاندھے ڈال دیئے تھے۔ اور رشید جبار نے بھی اعتراف کر لینے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔"

"اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ تم قبر تک پیچھا نہ چھوڑنے والے شکاری کتوں میں سے ہو"

"لفظ شکاری کے اضافے سے عزت افزائی نہیں محسوس کر سکتا! اب تم دفع ہو جاؤ مریل کتیا...!" انور نے اس کا کان پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا اور فلیٹ سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا۔

ختم شد

مہم جوئی اور ایڈونچر
سے بھرپور ناول
بلدران کی ملکہ
ابنِ صفی
ایڈونچر مہم جوئی اور سپنس سے بھرپور ناول
ابنِ صفی کی آخری تحریر
شمال کا فتنہ
ابنِ صفی

شکرال کی سرزمین پر جنم لینے والی

حیرت انگیز کہانیاں

معزز کھوپڑی

ابنِ صفی

جاسوسی اور طنز و مزاح پر

بہترین کہانیاں

قابلِ اعتراض تصویر

ابنِ صفی